منشی نولکشور اور ان کی ادبی خدمات



مرتب

ڈاکٹر آصفہ زمانی

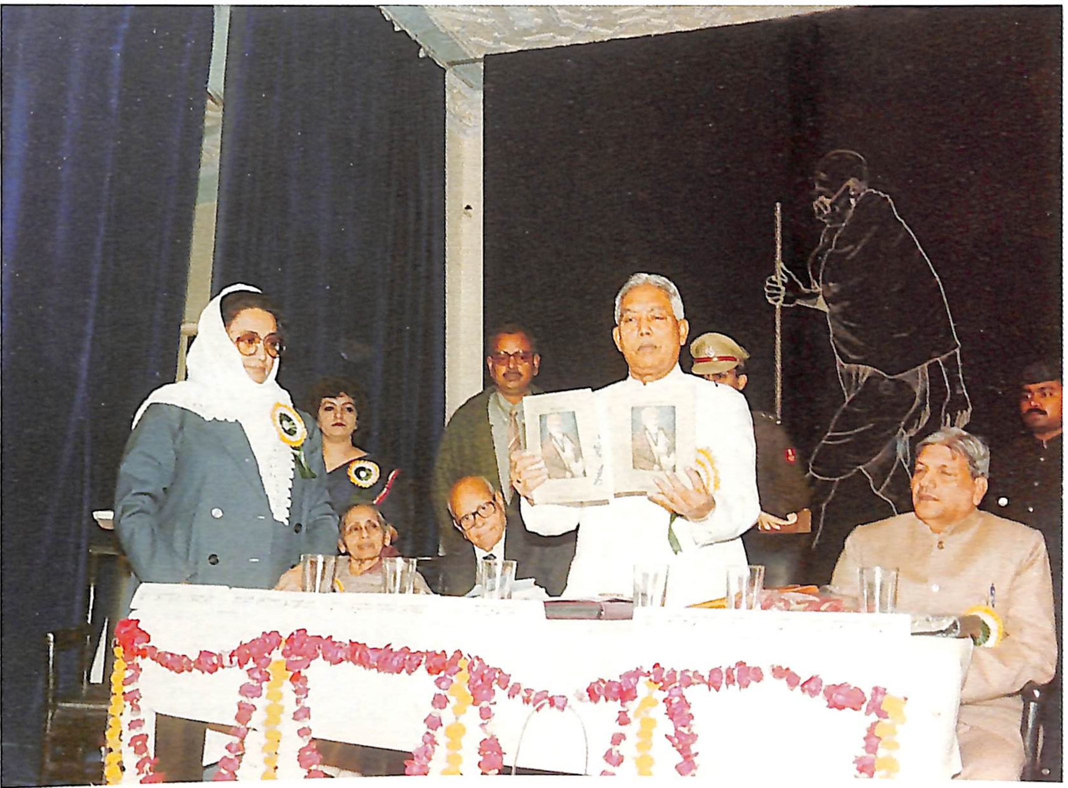
منشی نولکشور
اور
ان کی ادبی خدمات

مرتب
ڈاکٹر آصفہ زمانی

نولکشور سمینار میں منشی نولکشور کی تصویر کی گل پوشی کرتے ہوئے محترم سورج بھان صاحب، گورنر اتر پردیش اور ڈاکٹر آصفہ زمانی۔



نولکشور سمینار میں "منشی نولکشور سوینئر" کا اجرا کرتے ہوئے گورنر اتر پردیش محترم سورج بھان صاحب



نام کتاب : منشی نولکشور اور ان کی ادبی خدمات
مرتب وناشر: ڈاکٹر آصفہ زمانی
تعداد : ۴۰۰
اشاعت : ۲۰۰۰ء
کمپوزنگ : یونک کمپیوٹر سنٹر شباب مارکیٹ، ندوہ روڈ، لکھنؤ۔ فون :330433
مطبع : روہتاشو پرنٹرس ۔ لکھنؤ
قیمت : -/۱۰۰ سو روپئے

تقسیم کار

ڈاکٹر آصفہ زمانی: اے جی ۳ ، راجیہ سمپتی کالونی ، مال اوینو، لکھنؤ

فہرست

منشی نولکشور کو منظوم خراج عقیدت

از : جناب عمر انصاری

ہندی کے ماہتاب تھے منشی نولکشور
اردو کے آفتاب تھے منشی نولکشور
عشاق فارسی، عربی کے بہت سہی
ان سب میں انتخاب تھے منشی نولکشور
لائیں کہاں سے ڈھونڈ کے ان کی مثال ہم
آپ اپنا بس جواب تھے منشی نولکشور
علم وادب سے کیوں نہ عبارت ہو ان کا نام
علم وادب کا باب تھے منشی نولکشور
مقبول ہو جو شیخ و برہمن میں ایک ساتھ
ایسی شرابِ ناب تھے منشی نولکشور
پیدا کہاں اب ایسے پراگندہ طبع لوگ
لاکھوں میں انتخاب تھے منشی نولکشور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"منشی نولکشور اور ان کی ادبی خدمات"
کل ہند سمینار.......... ایک جائزہ

۱۶ر دسمبر ۱۹۹۸ء کو لکھنؤ یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی طرف سے "منشی نولکشور اور ان کی ادبی خدمات" کے عنوان سے یک روزہ نیشنل سمینار کا انعقاد کیا گیا۔ منشی نولکشور اگرچہ خود کوئی ادبی شخصیت نہیں تھے تاہم وہ بذات خود ایک ادبی ادارہ تھے، جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے اس پر آشوب دور میں جبکہ ہزاروں کتابیں یا تو تلف ہو گئی تھیں یا بیرون ملک بھیجی جا رہی تھیں، انہوں نے اردو و فارسی و ہندی و سنسکرت اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی ہزاراں ہزار کتابوں کو انتہائی محنت و جاں فشانی سے اکٹھا کر کے اس وقت کے ذرائع اور دسترس کے مطابق، صحت و ترتیب و تنظیم کے ساتھ انتہائی کم قیمت پر اپنے مطبع سے شائع کر کے ہمارے عظیم علمی و ادبی و تہذیبی و ثقافتی ورثے کو ابدالآباد تک محفوظ کر دیا۔

منشی جی اگرچہ بنیادی طور پر ایک صحافی و تاجر تھے، لیکن بحیثیت انسان بلند نظر اور مذہبی تعصب سے یکسر بے نیاز تھے۔ ان کا مطمح نظر ہر علوم و فنون کی خدمت و اشاعت تھا انہوں نے جہاں رامائن، بھاگوت گیتا اور مہابھارت کی اشاعت کی وہاں توراۃ، انجیل، گرو گرنتھ، جنم ساکھی، قرآن و فقہ و حدیث و تفسیر کی بھی اشاعت کی۔ قرآن مجید کی چھپائی کے وقت تو وہ اس قدر اہتمام کرتے کہ پہلے مشینوں کو دھلواتے، اس کے نیچے سفید چادر بچھواتے تاکہ کوئی پرزہ زمین پر نہ گرے مشین میں حتیٰ کہ خود بھی باوضو ہوتے۔ منشی جی کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ

باہری ممالک میں لوگ سمجھتے تھے کہ منشی نو لکشور کوئی شخص نہیں بلکہ ہندوستان کا کوئی مشہور شہر ہے۔ مرزا غالب دہلوی نے ان کے متعلق کہا تھا: "خالق نے انہیں زہرہ کی سیرت اور مشتری کی صورت عطا کی ہے" انہوں نے منشی جی کے مطبع کی تعریف کرتے ہوئے ایک خط میں لکھا ہے کہ "مطبع منشی نو لکشور نے جس کا دیوان چھاپا اسے آسمان پر پہونچادیا۔" اور منشی پریم چند جی سے جب انکی سوانح عمری لکھنے کے لئے کہا گیا تو انہوں نے فرمایا :

".......ایسی گوناگوں شخصیت کی سوانح عمری لکھنے کے لئے شہد میں ڈوبے ہوئے سنہرے قلم کی ضرورت ہے"

آج دنیا کا کوئی کتب خانہ ایسا نہیں جہاں منشی نو لکشور کے مطبع کی چاپ شدہ کتابیں موجود نہ ہوں۔ بھارت کے ایسے عظیم سپوت کی یاد میں ایک نیشنل سمینار ہو، یہ میرے شوہر جناب اعزاز رضوی (وزیر غذا اور سد اترپردیش) کی تجویز تھی، جو قومی یکجہتی کے زبردست حامیوں میں سے تھے مجھے ان کی یہ تجویز پسند آئی، سوچا گیا کہ ۲۲ر فروری کو منشی نو لکشور کے یوم وفات کے موقع پر یہ سمینار کیا جائے۔ لیکن کچھ نامساعد حالات کی بنا پر یہ سمینار بروقت نہ ہو سکا اسی درمیان میری زندگی کا وہ المناک حادثہ پیش آیا، یعنی میرے شوہر جناب اعزاز رضوی صاحب کی اچانک وفات (۱۱ستمبر ۱۹۹۸ء) جس سے میری پوری زندگی متزلزل ہو اٹھی۔ اپنے مرحوم شوہر کے اس خواب کو پورا کرنے کی دھن نے میرے ٹوٹے ہوئے دل کو نہ جانے کہاں سے اتنی توانائی عطا کردی کہ میں اس شکستگی کے عالم میں بھی اس عظیم کام کو انجام دینے کے لئے پورے عزم وارادے سے اٹھ کھڑی ہوئی، ممنون ہوں اپنے کرم فرما حضرات کی جنہوں نے میری ہمت افزائی کی اور میری آواز پر لبیک کہا۔

ماہ فروری ہی سے مجھے منشی نو لکشور سمینار سے متعلق مختلف ریاستوں سے پیغامات موصول ہونا شروع ہوگئے تھے جن میں مختلف ریاستوں کے وزراء مختلف گورنر حضرات

اور خاص کر عزت مآب محترم کے۔ آر۔ نارائنن، صدر جمہوریہ ہند اور عزت مآب محترم اٹل بہاری واجپئی جی، وزیر اعظم ہند کے پیغامات قابل ذکر ہیں۔ ان پیغامات کو یکجا کر کے منشی جی کے خاندانی شجرے اور یادگاری تصاویر کے ساتھ نیز ان کے مطبع سے شائع کردہ معروف کتابوں کی فہرست کے علاوہ چند دانشور حضرات کے مضامین کو شامل کر کے ایک یادگاری مجلّہ، سونیر کی شکل میں شائع کیا گیا، جس کا افتتاح، عالی جناب محترم سورج بھان صاحب گورنر اتر پردیش کے دست مبارک سے سمینار کے افتتاحیہ اجلاس میں عمل میں آیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر شیمہ رضوی کی انگریزی زبان میں لکھی ہوئی کتاب "گرامر آف اردو غزل" اور مجھ ناچیز کی سترھویں تصنیف "نگارشات زمانی" (جس پر بعد اردو اکادمی اتر پردیش کا پہلا انعام ۱۹۹۸ء بھی حاصل ہوا) کی رونمائی بھی گورنر صاحب کے دست مبارک سے ہوئی۔

سب سے پہلے گورنر صاحب اور وزیر اعلیٰ تعلیم نے منشی نولکشور کی تصویر کی گلپوشی کی۔ اس کے بعد سمینار کی ابتدا، اردو کے کہنہ مشق شاعر جناب عمر انصاری صاحب کی نظم سے ہوئی، جسے انہوں نے منشی نولکشور کی شان میں قلم بند کیا تھا، اسے معروف گلوکار جناب اقبال صدیقی صاحب نے اپنی مسحور کن آواز میں ترنم سے پیش کر کے سماں باندھ دیا۔

محترم عالی جناب سورج بھان صاحب، گورنر اتر پردیش، سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے علاوہ ادبی مشاغل میں بھی انتہائی انہماک اور دلچسپی رکھتے ہیں اور خصوصاً اردو فارسی کے دلدادہ و شیدا ہیں چنانچہ یہ انہیں کی کرم فرمائی کا نتیجہ تھا کہ یہ سمینار گورنر ہاؤس کے وسیع و عریض "دربار ہال" (گاندھی بھون) میں منعقد ہوا اور انہوں نے انتہائی محبت و خلوص سے اسکا افتتاح فرمایا۔ میرے شکریہ ادا کرنے پر انہوں نے اپنی افتتاحی تقریر میں فرمایا کہ دربار ہال میں یہ تقریب کر کے میں نے نہیں ڈاکٹر آصفہ زمانی نے میرے اوپر احسان کیا ہے کہ منشی نولکشور جیسی ادب نواز ہستی کو انہوں نے یہاں سمینار کر کے متعارف کرایا، جنہیں آج کی نئی

نسل فراموش کرتی جارہی ہے۔ گورنر صاحب نے اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے منشی نولکشور کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے کہا کہ "منشی جی کا یہ سب سے بڑا کارنامہ ہے کہ انہوں نے اردو و فارسی و ہندی و سنسکرت میں کتب شائع کر کے ہمارے عظیم تہذیبی ورثے کی حفاظت کی"۔

ڈاکٹر نریندر سنگھ گور، وزیر اعلیٰ تعلیم اتر پردیش نے مہمان خصوصی کی حیثیت سے شرکت کی۔ انہوں نے بھی منشی جی کی علم دوستی پر جامع تقریر کی۔ پروفیسر امیر حسن عابدی، سابق صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی نے اپنا کلیدی خطبہ دیتے ہوئے منشی جی کے نام سے میوزیم کھولے جانے کی درخواست کی۔ پروفیسر روپ ریکھا ورما، وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی اور محترمہ لیلا بھارگوا نے بھی منشی نولکشور کی گرانقدر خدمات کو سراہا۔ جلسہ میں گورنر صاحب، ڈاکٹر گور صاحب، وائس چانسلر صاحبہ، رانی صاحبہ اور پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب کی گلدستوں سے پذیرائی کی گئی اور بہت خوبصورت میمینٹو جن پر منشی نولکشور کی تصویر کی عکاسی کی گئی تھی ان کی خدمت میں پیش کئے گئے۔ افتتاحی جلسہ کی نظامت کرتے ہوئے میں نے شعبۂ فارسی کے لئے منشی نولکشور چیئر کی یاد دہانی کرائی جس کی مانگ لکھنؤ میں منعقدہ آل انڈیا پرشین ٹیچرز کانفرنس میں ۱۹۸۱ء کو کی گئی تھی۔ محترم جناب سورج بھان صاحب گورنر اتر پردیش، محترم گور صاحب وزیر اعلیٰ تعلیم اتر پردیش، محترمہ پروفیسر روپ ریکھا ورما، وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی نے اس کی تائید کرتے ہوئے بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔

سمینار کے بقیہ اجلاس لکھنؤ یونیورسٹی کے ڈی۔ پی۔ اے۔ ہال میں منعقد ہوئے جلسہ میں لکھنؤ کے ادیبوں، شعراء اور دانشوروں کی پوری کہکشاں موجود تھی۔

اختتامی اجلاس کی صدارت پروفیسر روپ ریکھا ورما، وائس چانسلر لکھنؤ یونیورسٹی نے کی۔ انہوں نے صدارتی تقریر میں منشی جی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اس سمینار کو، الحاج سید محمد اعزاز رضوی (وزیر غذا اور سد اتر پردیش) کے نام منسوب کیا۔ اس جلسہ میں

ہر مقالہ نگار کو وائس چانسلر صاحبہ کے ہاتھوں سے منشی نولکشور میمینٹو پیش کئے گئے سمینار میں باہر سے آئے ہوئے پروفیسر حضرات نے سمینار کے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ یک روزہ سمینار حقیقتاً ایک یادگار سمینار ہے جو بڑے سے بڑے سہ روزہ سمینار پر بھاری ہے۔

اس سمینار میں پروفیسر ایس۔پی۔دکشت، سابق صدر شعبۂ ہندی لکھنؤ یونیورسٹی کو بھی دعوت دی گئی تھی لیکن وہ کسی سبب حاضر نہ ہو سکے۔

پروفیسر وارث کرمانی، سابق صدر شعبۂ فارسی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ایک جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے منشی جی کی مجموعی خدمات پر روشنی ڈالی۔

یہ کل ہند سمینار اردو اکادمی اترپردیش کے جزوی مالی اشتراک سے منعقد ہوا۔ سمینار کے انعقاد میں لکھنؤ یونیورسٹی اور حکومت کا بھی تعاون حاصل رہا، جسکی وجہ سے یہ سمینار بڑے ہی پرشکوہ انداز میں ہو سکا۔ اس تعاون کے لئے میں اپنی وائس چانسلر صاحبہ اور حکومت کی بیحد ممنون ہوں۔ محترمہ رانی لیلا بھارگو صاحبہ کی بھی ممنون ہوں کہ انھوں نے بھی بے حد سرگرمی سے حصہ لیا اس سمینار میں ہر مقالہ نگار کو میمینٹو کے علاوہ دیدہ زیب فولڈر مع پین، ڈائری، خبرنامے، رسالہ "نیادور" سونیئر اور پیڈ کے، پیش کئے گئے ساتھ ہی اس سمینار کی خصوصیت یہ بھی تھی کہ پہلی بار مقالہ نگار حضرات کو خوبصورت سوٹ کیس بھی دئے گئے جن پر انگریزی اور فارسی میں سمینار کا نام مع یونیورسٹی لوگو کے مندرج تھا۔ اس موقع پر امیر الدولہ پبلک لائبریری کی طرف سے منشی نول کشور کی شائع شدہ کتابوں کی نمائش بھی لگائی گئی۔

قارئین گرامی! وہ سبھی گرانقدر مقالات جو اس سمینار میں پیش کئے گئے کتابی صورت میں آپکے سامنے ہیں۔ مجھے امید ہی نہیں یقین کامل ہے کہ منشی نولکشور کی ادبی خدمات کو اجاگر کرنے میں یہ مقالات معاون ثابت ہوں گے۔

ڈاکٹر آصفہ زمانی

صدر

شعبۂ فارسی۔ دانشگاہ لکھنؤ

نولکشوری دیوان حافظ کی تقریظ اور تاریخ وتشریح

پروفیسر سید امیر حسن عابدی

دھلی یونیورسٹی

منشی نولکشور مرحوم نے اردو، فارسی، عربی، بلکہ یوں کہوں کہ اسلامیات کی جتنی خدمت کی ہے کسی مسلمان نے بھی نہیں کی ہے۔ قرآن کی طباعت میں منشی صاحب اتنا اہتمام کرتے تھے کہ خود وضو کر کے اسے ہاتھ لگاتے تھے، نیز اسکی پلیٹوں کو دھلواتے وقت خیال رکھتے تھے کہ اسکا پانی گندی نالیوں میں نہ جائے، دنیا کا کوئی مشرقی کتب خانہ ایسا نہیں ہے جہاں انکے مطبع کی چھپی ہوئی کتابیں موجود نہ ہوں مجھے اب تک یاد ہے کہ جب میں مشہد کے آستانہ قدس رضوی کے کتبخانہ میں گیا تو وہاں کے لوگوں نے بڑے فخر سے مطبع نولکشور کی مطبوعہ کتابیں دکھلائیں۔ فارسی کی کوئی بڑی کتاب لے لیجئے غالباً سب سے پہلے وہ ہندوستان اور وہ بھی منشی نولکشور کے مطبع کی چھپی ہوئی ملے گی۔

امیر حسن نورانی صاحب مرحوم سے سب سے پہلی ملاقات اسی مطبع میں ہوئی تھی۔ انکا نام میں نے اسلئے لیا کہ انہوں نے بہت سے مقالے منشی صاحب اور انکے مطبع کے متعلق لکھے ہیں، وارثان نولکشور نے آل انڈیا پرشین ٹیچرس کانفرنس کے موقع پر ہم سب کو اپنے یہاں مدعو کیا اور ہمارے جلسوں میں شرکت کی۔ اس وقت میں نے اپنے خطبہ صدارت میں یہ تجویز رکھی تھی کہ ایک سڑک، خاص کر وہ سڑک جو مطبع کے سامنے ہے، منشی صاحب کے نام پر رکھی جائے یہی کافی نہیں ہے بلکہ چاہئے کہ ایک ایسا میوزیم قائم کیا جائے جس میں اس مطبع کی تمام شائع کردہ کتابیں وغیرہ جمع کی جائیں نیز ہر کتاب کے جتنے ایڈیشن ہیں انہیں

اکٹھا کیا جائے۔

بہر حال میں نے جب باقاعدہ فارسی پڑھنا شروع کیا، تو اس مطبع کے شائع کردہ دیوان حافظ سے ابتدا کی۔ حافظ، فارسی زبان وادب کا سب سے بڑا شاعر ہے، جس کا شمار دنیا کے بڑے شعراء میں ہوتا ہے نیز ان کو "لسان الغیب" کہا گیا ہے۔ گوئٹے آپ سے اتنا متاثر تھا کہ اس نے اپنے ایک دیوان کا نام "الدیوان الشرقی للمؤلف الغربی" رکھا۔ مغل بادشاہ خاص کر ہمایوں اور جہانگیر 2 دیوان حافظ سے فال نکالا کرتے تھے نیز وہ قلمی نسخہ خدا بخش میں موجود ہی نہیں ہے بلکہ شائع بھی ہو گیا ہے۔ گورودیو، رابندر ناتھ ٹیگور کے والد کو "حافظِ حافظ" کہا جاتا تھا۔ جب گورودیو ایران گئے تو شیراز میں انہوں نے مزار حافظ پر انکے دیوان سے فال نکالا تھا، نیز اس موقع پر میرے استاد مرحوم ڈاکٹر محمد معین نے ایک مقالہ لکھا تھا، جس کا عنوان تھا "زیارت گہ رندان"۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ جب میں تبریز میں ایران کے سب سے بڑے دوزبانہ شاعر شہریار سے ملا، تو انہوں نے فرمایا کہ آج تک کوئی بھی حافظ کو نہ سمجھ سکا۔

آج دیوان حافظ کا سب سے زیادہ معتبر نسخہ، نسخہ علامہ قزوینی اور قاسم غنی سمجھا جاتا ہے۔ علامہ نے ۱۳۳۱ھ / ۱۹۱۳ء اور ۱۳۳۴ھ / ۱۹۱۶ء دونوں لکشوری نسخوں کا ذکر کیا ہے۔ انہوں نے صرف دیوان ہی ایڈٹ نہیں کیا، بلکہ دو اور جلدیں بھی تیار کیں، جو عصر حافظ اور تصوّف سے متعلق ہیں۔

پروفیسر نذیر احمد صاحب نے جونپور کی خانقاہ رشیدیہ سے وہ نسخہ نکالا ہے جو مقدمہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ قدیم ہے۔ علاوہ برایں انہوں نے تین اور نسخوں کی بنیاد پر تین جلدیں تیار کی ہیں۔ اس سلسلہ میں مرحوم استاد پرویز ناتل خانلری اور پژمان بختیاری کا ذکر کرنا ضروری ہے جنہوں نے بڑی محنت سے دیوان حافظ کو مرتب کیا ہے۔ ابھی حال میں میرے دوست ہوشنگ ابتہاج صاحب نے برسوں کی محنت کے بعد دیوان حافظ کا بہترین

ایڈیشن شائع کیا ہے۔ مرحوم استاد مسعود مرزا کا بھی ذکر کرنا ضروری ہے جنہوں نے دنیا بھر کے کتب خانوں میں دیوان حافظ کو دیکھا اور انکے دیوان کو تین رنگوں میں شائع کیا ہے۔ ایک وہ ہے جس میں مجاز ہی مجاز ہے دوسرا وہ جو حقیقت ہی حقیقت ہے اور تیسرا وہ جس میں حقیقت و مجاز کی آمیزش ہے۔

بہر حال میری نظر سے جو نولکشوری نسخے گذرے ہیں ان میں سے ایک تو وہ ہے جو ۱۲۸۵ھ / ۱۸۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں مولانا محمد ہادی علی اشک کی یہ تقریظ ہے :

"تر زبانی قلم بستایش آفرید گاریست، کہ بحر رحمتش لجۂ ناپیدا کناری، قطرہ ای از سحاب حلمتش محیط اعظم و ہفت دریا از رشحات قدر تش شبنم۔

بیت ؎

ہر موج بحمد او زبانست
عمان از قطرہ سبحہ خوانست

وروانی خامہ بہ نیایش سر فراز یست، کہ انبیارا از انتسابش آبروئی وامتیازی، تا گوہرش آب درجوی رسالت آوردہ، دختر عصیان امّت باک سپردہ۔

بیت ؎

تا بر در رحمت سر مزارش
بر تربت آل وچار یارش

سپس این لآلی آبدار لفظ و معانی، بل فراید اسرار خداداد نیست۔ جلای رکن من الشعر لحکمۃ دیدہ وبصفا رکن من البیان لسحر رسیدہ، انوار قبول یافتہ بہ لمعان درازی تاختہ اعنی کلام لسان الغیب مجموعۃ اعجاز طرازی، دیوان خواجہ شمس الدین حافظ شیرازی، کہ ہر شعرش شعری مقام است و مضمونش سراپا الہام۔ لفظ لفظش از زیور توفیق علی بند و تائید روح القدس را با حرف حرفش

پیوند۔ گل وریحان طریقت راچمنی وشناسندگان حقیقت راانجمنی۔ اصحاب محوزادروازہ براخ کشتادہ اندکہ:

فرد

دستی بکاربالیش وزجان دل بیارباش
ازغمزہ اش فریب مخورھوشیارباش

وطالبان سکرراصلای عام درداد ندکہ:

شعر

ہاں بیاعالم آب است اینجا
دورمی بزم شرابست اینجا

پیمانۂ وحدت بررندان دردآشام پیمودہ واز جرعۂ محبت قلندران صاف مشرب راست نمودہ۔ رہروان منازل شوق وبادیہ طلب رفع کلال راایں نعمہ برزلب:

الایا ایہا الساقی ادرکاساً وناولہا
کہ عشق آسان نمودا اوّل ولی افتاد مشکلہا

ومخوران بادہ عرفان بی اندیشۂ محتسب وقاضی مینارایپۂ دھن دیدہ باربار متقاضی:

شعر

ساقیابرخیزودردہ جام را
خاک برسرکن غم ایام را

عرض سخنہایش بس بلند است، نتایج ارجمند است۔ کمند ہرخیالی کی برین بام خواہد رسید وطایراوہام کجابرکنگرہ لیش تواند پرید؟ وتناقض مطالب ھمہ رافال زن مراد وباختلاف طبایع ازمذاق مورد آباد۔

درین زمان قدر سنگ علم و ہنر منشی نول کشور نام آور، ہمت عالی را کار بست و پنجہ این شاھد رانگار بست غازۂ طبعش بر رو مالید و سرمۂ این سواد بچشمش کشید۔ ھمانا کہ موای نفع رسانی برافراشت و قفل از گنجینۂ فیض برداشت۔ نامہ سیاہ ازلی محمد ھادی علی، کہ پیش ازین روزگاری بہ تحشیۂ چند اجزا الیش در ساختہ است و حال این جریدۂ معنی پرداختہ، چوں آرایش نو دید، بہزار جانش پسندید۔ جواھر تحسین بر نظم فریض افشاند و برسم نثار قراضۂ تقریظ افشاند۔"

دوسرا نسخہ جو تیرھویں مرتبہ ۱۳۱۰ھ / ۱۸۹۱ء میں شائع ہوا، اسکی کتابت۔ "سر حلقۂ خوشنویسان یگانۂ روزگار، سر دفتر خطّاطان جواھر نگار، استاد سحر طراز، جادو قلم، منشی محمد شمس الدین صاحب المخاطب بہ "اعجاز رقم" نے کی۔ نیز "رونق بخش محفل خوبش مقال، سخن سنج بی مثال، جامع فضل و کمال روشن شمع تحقیق، مصباح جمع تدقیق، فصیح طلیق اللسان، منطبق، بلیغ البیان، فروغ مطلع معنی شناسی، مولوی عبد العلی مدراسی نے تاریخ کہی :

حمدت ربی علا مکاناً شکرت للہ جل شاناً
ذکاء معنی حلت بیاناً علی الوریٰ من ذکاء حافظ

بحکم منشی نولکشور زدند بر سنگہای دلکش
کہ روی سنگین دلان مہوش نمودہ کسب ضیای حافظ

ز فرط شادی چو گل شگفتم دری بالماس خامہ سفتم
فروغ سالش بدیہہ گفتم "کلام معجز نمای حافظ"

اس سلسلے کی سب سے زیادہ اہم تالیف شرح دیوان حافظ ہے، جو مولانا سید محمد صادق علی رضوی حنفی لکھنوی نے منشی صاحب کی فرمائش پر لکھی تھی اور جو ۱۲۹۲ھ / ۱۸۸۶ء

میں شائع ہوئی۔

ہم نے اب تک فارسی زبان وادب کو وہ اہمیت نہیں دی ہے جس کی وہ مستحق ہے اس میں ہماری تہذیب و تاریخ کے وہ بے شمار گوشے ملیں گے جواب تک ہماری نظروں سے پوشیدہ رہے ہیں اور جن سے عام تاریخ کی کتابیں محروم ہیں نیز ضرورت ہے کہ ان پہلوؤں کو زیادہ سے زیادہ اجاگر کیا جائے، تاکہ ہمارے ملک کی تاریخ اور تہذیب زیادہ سے زیادہ روشن ہو سکے۔

بہر حال مولانا اپنی شرح کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

"ای مقام تو ابتدای سخن
اوّلین وصفت انتہائی سخن
نیست موجودبی تو موجودی
نیست غیراز تو ہیچ معبودی
جوشش ملک کاینات از تست
ھمہ ذرّات را حباب از تست

حمد بی حدو ثنای بی عدو احدی راسزاست، کہ دیدۂ دوستان را بنور ھدایت خویش بینای حقایق اشیاگر داپندہ است۔۔۔۔۔

امابعدمی گوید سید محمد صادق علی رضوی نسب، حنفی مذھب، کہ حضرت خواجہ حافظ شیرازی در غزل گوئی گوی سبقت از اقران وامثال ربودہ۔۔۔

حسب الحکم والاجناب۔۔۔ منشی نولکشور۔۔۔ بشرح ایں درّۂ فاخرہ پرداختم۔۔۔

و۔۔۔ در عرصۂ چندماہ۔۔۔ درحیز تحریر در آوردم۔"

اس شرح میں بہت سی حکایتیں اور حقایق ہیں، جن میں سے بعض کو یہاں ترتیب

سے بیان کیا جارہا ہے۔ ۱۱۲۱ھ (۱۰۔۱۷۰۹ء) برھانپور میں ایک درویش بارہ سالہ خوبصورت بچے کو "قدوۃ الابرار..... شیخ عیسیٰ سندی، کے پاس لے گیا۔ شیخ نے اس سے کچھ کہنے کو کہا اس پر اس نے مقام و محل کی مناسبت سے کچھ ابیات پڑھے، جنھیں شارخ نے نقل کر لئے اس مثنوی کی ایک بیت یہ ہے۔

بی نشان شواز ھمہ نام و نشان

تا بہ بینی روی جانان در میان

دوسری حکایت یہ ہے کہ حافظ اپنے شہر والوں سے دلتنگ ہو کر کہیں اور چلے گئے۔ وہاں ایک عالم خواجہ کے اس شعر کا مطلب بیان کر رہے تھے۔

از خیال لطف می مشاطۂ چالاک می

در خمیر برگ گل خوش می کند پنہاں گلاب

خواجہ نے انکی تعریف کی اور یہ بھی کہا کہ خود انکا یہ مطلب نہ تھا۔ مگر نسخہ قزوینی میں یہ بیت بلکہ پوری غزل نہیں ہے۔

ایک اور حکایت میں شارح نے لکھا ہے کہ ہمایوں بادشاہ جب اپنے پہلے دور حکومت میں سنبھل پہنچے، تو وہاں کوئی عالم، حافظ کے اس شعر کا مطلب بیان کر رہا تھا۔

عدو کہ منطق حافظ جمع کند در شعر

ھماں حدیث ھما و طریق خطا نست

مگر یہ شعر بھی نسخہ قزوینی میں نہیں ہے۔ آگے چل کر شارح نے حافظ کے اس شعر کی تشریح کرتے ہوئے۔

عجیب واقعہ و غریب حادثہ ای

انا اصطبرت قتیلاً و قاتلی شاکی

بو علی قلندرؒ کا یہ شعر نقل کیا ہے ؎

دل مجروح تیغ غم رقیب از دست من نالان
جفا پروانہ و مسکین خودش از آشیان خیزد

شارح خود بھی شاعر تھے اور غالبؔ تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے بے شمار اشعار اور ابیات شرح دیوان حافظ کے سلسلہ میں نقل کئے ہیں۔ ان میں سے بعض یہاں دیے جا رہے ہیں:

علم کزوی ھردوعالم رھبراست
طرفہ کان ھم رھزن وھم رھبر است
بوالعجب رمزیست سرّی بس شگرف
غالبا می بین مگوکین بہتر است

شارح نے اپنے منابع میں منطق الطیر، مہذب قرآت المعانی، سبحۃ الابرار وغیرہ سے استفادہ کیا ہے۔

اس مقالے سے یہ بھی اندازہ ہو سکے گا کہ نولکشوری نسخہ میں بہت سی غزلیں الحاقی ہیں۔

نولکشور اور غالب

فکر وعمل اور علم وفن کے روابط کی روشنی میں

پروفیسر شعیب اعظمی

جامعہ ملیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی

منشی نو لکشور (م ۱۸۳۶ء-۱۸۹۵ء) کی ذات والا صفات کسی تعارف کی محتاج نہیں یہ ہماری بدبختی اور کم نصیبی ہو گی اگر ہم ان کی خدمات اور کارناموں سے بے خبر ہوں، جس شخصیت نے ہمارے ماضی کی ثقافتی اور تمدنی میراث کی نگہبانی کی ہو، علوم وفنون کو از سر نو حیات تازہ بخشی ہو، اہل علم کی سر پرستی کی ہو، اہل ذوق وہنر کے ہاتھوں میں جدید طباعت اور اشاعت کے تازہ ترین موضوعات اور اخبارات کو لے کر ان کے مذاق صحیح کو نکھارا ہو اور فیاضی، سخاوت اور اعانت کے وہ دروازے کھول دئے ہوں جو اداروں، انجمنوں اور درباروں سے ممکن نہیں اور ایسے اسباب فراہم کر گئے جو آئندہ نسلوں کے لئے افتخار اور امتیاز کا وسیلہ بنے، اسے یاد رکھنا امر لازم ہے۔

محنت، مشقت، محبت، مروّت، دیانت، شرافت اور اخوت جیسی وہ تمام صفات جو جماعت اور قوموں کو بمشکل میسر آتی ہیں وہ سب کچھ بفضل خداوندی منشی نو لکشور کو ودیعت ہوا تھا، یہ منشی صاحب کی سعادت تھی کہ یہ تمام خوبیاں انہوں نے بزور بازو حاصل کی تھیں اور خدائے بخشندہ نے تو اسی لئے ان کو اس دنیا میں بھیجا ہی تھا۔

چشتی، کبیر ونانک کی سر زمین پر جن کا نام انگلیوں پر شمار کئے جانے والوں میں لیا جا سکتا ہے، جنہوں نے ان کی تعلیمات، اخلاق واقدار یگانگت اور محبت کے ڈول ڈالے تھے، ان کی ہمواری، استحکام اور فروغ میں منشی نو لکشور کا نام نامی صف اول میں ہے۔ ان آداب، خلق

عظیم اور عظمت انسانی کا جو عنصر ان کی ذات میں تھا ان کی کہانی ہمارے مؤرخ، مصنفین، شعراء اپنی سکت کے تحت بیان کرتے ہیں لیکن سچ تو یہ ہے کہ ان کی خدمات اور کارناموں کا احاطہ کرنے میں ہم سب ناکام رہے ہیں منشی صاحب بقول کسے تھوڑے سے تصرف کے ساتھ:

بڑی وسعت ہے ان کی داستاں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اس کا

جس شخص نے اوستا کی گاتھاؤں، مقدس وید کے اشلوکوں، بائبل کی شرحوں، قرآن کی تفسیروں اور گرونانک کے گرنتھوں کو عمدہ اور عام اشاعتوں سے پارسیوں، ہندوؤں اور دوسرے صحف کی عظمت کے چراغ روشن کردئے ہوں رامائن، مہابھارت، شاہناموں کی رزمیہ داستانیں پڑھوا کر قومیت اور وطن پرستی کے جذبات ابھارے ہوں، صحیح بخاری، مسلم، ترمذی، ہدایہ، مقامات حریری وھمدانی اور حماسہ جیسی نوادرات بازار میں لاکر محدثین اور فقہا کا فرض کفایہ ادا کیا ہو، بوعلی ورازی کی تشخیص اور نسخے مہیا کرکے بیمار دلوں کی مسیحائی کی ہو، کافیہ، شافیہ، احیاء العلوم کے متن اور تراجم سے لوگوں کے ذہنوں کو وسعت بخشی ہو، طلسم ہوشربا اور فسانہ آزاد الف لیلہ کو آسمانوں سے اتار کر زمین پر لائے ہوں، اور محفل احباب میں جان ڈال دی ہو اور مجتہد العصر اسد اللہ خاں غالب کو بھی وقت گزاری کا سامان فراہم کیا ہو، ادبیات اور شعر و شاعری کے شیدائیوں کے حلقہ میں مثنوی، حدیقہ، منطق الطیر، تذکرۃ الاولیاء، شاہنامہ، سکندر نامہ، خمسہ، پنج گنج، انوری، ظہیر اور خاقانی کے قصاید سعدی اور حافظ کے کلیات و دیوان عرفی شیرازی سے لے کر مرزا اسد اللہ خاں غالب کے نثری و شعری تخلیقات چھاپ کر صلح کل، موحدی، وسیع المشربی، سلامت روی، اور قفا خوریم و ملامت کشیم وخوش باشیم کہ طریقت مادر طریقت ماکافریست رنجیدن کی شراب الست کے جام تھما کے کیا اس کی خدمات کا احاطہ کرنا آسان ہے؟

منشی جی کی شخصیت کا یہ پہلو اتنا روشن ہے جس پر ہزار رخوبیاں قربان، ان کے تمام

کارنامے اور خصوصاً ادب، مذہب، تاریخ، طب، فلسفہ، شاعری، شرحیں، تفسیریں، تراجم، لغات و قواعد سنہرے حروف میں نہیں لکھے گئے مگر ان علوم وفنون کی تاریخ جب بھی مرتب ہوتی رہے گی انہیں فراموش نہیں کیا جائیگا۔ آج کی میڈیا، صحافت، ناشر، کاتب، جلد ساز، انہیں دعائیں دیں جن کی کوشش نے اس صحرا کی خاردار سرزمین سے کتنے خار خسک نکال پھینکے اور ہندوستان میں تحقیق، تصنیف، تالیف، طباعت، کتاب فروشی، پریس اور اہل علم و فضل کو یکجا کر کے دائرۃ المعارف علمی کی بنیاد ڈالی۔ اودھ اخبار، اودھ ریویو اجرا کر کے ہندوستان کو امیر اللہ تسلیم، قدر بلگرامی، رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر اور حیرت دہلوی جیسے مایہ ناز ادیب و شعراء فراہم کر سکے۔ ایران، افغانستان اور جہانِ فارسی سب مل کر بھی ایسی مایہ ناز ہستی کا مثل پیدا نہیں کر سکے۔ امیر کابل عبدالرحمان خاں ان کو کابل تک لے جانے کے خواہش مند تھے۔ امریکی سیاح گارساں وتاسی کے توصیفی بیان کو چھوڑیے، ان کے ہم عصر جدید منشی وجاہت علی کے کلمات جو اخبار عالم میں بطور سند موجود ہیں پڑھیے۔

"منشی نو لکشور صاحب کے اوصاف و حالات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔ ہندوستان اور عرب و عجم اور انگلستان و مصر و روم و فرانس ان سب ملکوں میں ان کا نام روشن ہے۔ اس شخص کو اگر بانی کتب علوم وفنون کہا جائے تو بجا ہے۔ حسن اخلاق، محبت، عالی ہمت اور دوست پروری میں منشی صاحب موصوف ہزارہا آدمیوں سے افضل و اعلیٰ ہیں"۔
(بحوالہ، امیر حسن نورانی، منشی نو لکشور ۸۳ صفحہ)

ہندو اور ہندوستان کی مٹی کے سپوت کی سرشت میں جب فارسی زبان و ادب کا ہمہ گیر عالمی اور وسیع المشربانہ شاعری کا خمیر شامل ہوا تو مقدس وید اور دیوان غالب کا آفاقی نظریہ منشی نو لکشور صاحب کی شخصیت میں جلوہ گر ہوا۔ اس پورے عہد میں نو لکشور اور غالب جیسی نادر شخصیتیں ایسی تھیں جن کے وجود تعلقات، اخلاص، اور بے ریائی اور وسیع المشربی،

احترام واکرام کی مثال ملنا مشکل ہے، غالب، نسل و نسب میں عجمی، طریق میں عربی، آگرہ میں پیدا، دہلی میں بود و باش، زمانہ کا نشیب و فراز دیکھے ہوئے جہاندیدہ، دوسری جانب منشی جی جوان ناتجربہ کار متھرا کی پاک زمین کا باسی، علیگڈھ کا پروردہ اور لاہور کی خاک چھانے دیار اودھ میں اپنی مذھبی تقشف کے باوجود ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترک کلچر کا نشان تھے۔ غالب کے ہندو شاگردوں کی بڑی تعداد منشی بہاری لعل، منشی شیو نارائن، ہیرا سنگھ، جواہر سنگھ، ہرگوپال تفتہ، والیان ریاست میں الور اور پٹیالہ ہندو سکھ مہاراجہ تھے۔ منشی جی کے حلقہ میں سر سید احمد خان، حالی، نذیر احمد، ہادی علی رشک، مولانا احسن کاکوروی، یگانہ چنگیزی اور عبدالحلیم شرر۔

غالب ماضی کے نوحہ خواں مگر انگریزوں کے نظام انکشافات و ایجادات کے معترف جس میں تامسن، لارڈ آکلنڈ، ہاکنس، ولیم فریزر، ایلن، جان کوپ ہارڈنگ اور برطانوی تاج و تخت سے متوقع قصیدہ خواں، بعضوں کے مرثیہ خواں اور بعض انگریز خاندان کی خواتین اور بچوں کی ہلاکت پر ماتم کناں۔ منشی جی کی کتاب تواریخ نادر العصر میں کرنل ایبٹ، کمشنر لکھنؤ اور پریس کے قیام میں معاون مسٹر ریڈ، مسٹر ولیم، مسٹر رافسس، مسٹر گومز، مسٹر کلاڈلیس، اور مسٹر الگزینڈر وغیرہ کی خدمت میں سپاس نامہ اور ان کی اعانت اور تعاون پر چیف کمشنر لکھنؤ کے ممنون۔ منشی جی کی احسان مندانہ تحریر کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو:۔

"بس کہ پنجاب میں مطبع متعلقہ راقم کا جس اہتمام قدردانی حکام سے مشہور تھا، فرط عنایت جناب صاحب ممدوح سے باوجود کم بضاعتی کے اسباب و آلات کلکتہ سے لایا۔ اس وقت سے آج تک نشیب و فراز زمانہ بہ خاص خداوندی جناب محتشم الیہ کے سبب سے یوماً فیوماً ترقی رہی بلکہ موقع احتمال ضرر میں برعکس فائدے حاصل ہوئے۔ اب کے ۱۸۶۳ء میں محتشم الیہ پانچ برس کے بعد آسائش روحانی اور صحت بدنی کے لئے پندرہ مہینے کی رخصت لے کر عازم ولایت ہونے لگے" (نادر العصر سے اقتباس)

منشی نو لکشور کی بھلمنساہت دیکھئے کہ نادر العصر میں انہوں نے جس عقیدت سے ہندو دھرم، ہندو حکمراں اور ہندوستان کا ذکر کیا ہے وہیں اسلامی حکمرانوں تیمور، اکبر، اور بہادر شاہ ظفر کے ذکر میں تعصب اور بے احترامی کا شائبہ بھی نہیں ہے۔ یہی نہیں انہوں نے تمام نوابین اودھ جن میں کئی ایک غالب کے بھی ممدوح ہیں، کے ذکر میں ان کی خوبیاں زیادہ اور خامیاں کم بیان کی ہیں۔

منشی جی کی یہ بے تعصبی اور تمام اقوام وادیان کا فراخ دلانہ احترام غالب کے اس رجحان کی یاد دلاتا ہے جو انہوں نے ایک مراسلے میں یوں لکھ بھیجے تھے :

"میں تو بنی آدم کو مسلمان یا ھندو یا نصرانی کو عزیز رکھتا ہوں اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہل دنیا قربت کہتے ہیں اس کو قوم ذات، مذہب اور طریق شرط ہے اور اس کے مراتب اور رواج ہیں" (غلام رسول مہر، غالب ص ۳۹۶)

منشی نو لکشور اور غالب کی یہ نظریاتی ہم آہنگی علمی حلقوں میں خوشبو بن کر مہک چکی تھی۔ غالب آغا میر کی ستم رانی اور بدامنی کے دور میں اس وقت آئے تھے جب منشی جی کا وجود جنم لے رہا تھا۔ منشی جی نے نوابوں کی آئے دن کی شورش میں انگریزوں کی انتظامی صلاحیت کا بچشم خود مطالعہ کیا تھا۔ اور اپنے مطبع کی روزافزوں ترقی ان حکمرانوں کی توجہ کے نتیجہ میں تھی جس کا اقتباس مندرجہ بالا اوراق میں ہوتا ہے۔

غالب نہ صرف دہلی کے منٹ منٹ حادثہ اور واقعہ سے باخبر رہا کرتے بلکہ ملک کے سیاسی اور علمی حالات اور میڈیا کی اہمیت سے آگاہ تھے اپنی تصانیف کو اچھی طباعت، کتابت سے آراستہ اور مطبع کی حیثیت دیکھ کر چھپواتے، لاگت، قیمت، فروخت، نفع اور نقصان کا مفصل حال ان کے اردو و فارسی خطوط میں بکثرت ملتا ہے، مطبع نو لکشور کی بجا شہرت، علمی، ادبی، دینی

اور دیگر علوم کے بیش بہا اردو فارسی عربی خزانوں کی اشاعت،اودھ اخبار کی سیاسی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کا چرچا ان کے سامعہ کو نواز چکا تھا۔ منشی جی کی ہمہ جہت شخصیت بے لوث خدمت اور تجارتی دیانت غالب سے بھی پوشیدہ نہ تھی اور غالب کی علمی و ادبی شخصیت شاعرانہ حیثیت اور مزاج سے منشی صاحب بھی نا آشنا نہ تھے چنانچہ جب منشی صاحب اپنے کسی تجارتی کام سے دہلی گئے تو غالب کے یہاں حاضری دینا نہ بھولے۔ غالب کی خوشی افتخار اور خورد نوازی کا نمونہ ملاحظہ ہو لکھتے ہیں :

”روشندل ،فرو نمانی گہر مہروز آزرم گستر، منشی نولکشور نام آور بدیں ویرانہ شاہجہان آباد نام گزار افتاد۔ از آنجا کہ درویش نوازی خوئی اوست ، بہ کلبہ احزان من روی آورد ،بشادمانی دیدارش خودرا چشم روشن گفتم مجموعہ نثرھائی پیشین کہ این صحیفہ یکی از آنہااست از والا برادر ہمایوں مہر خجستہ القاب ضیاء الدین خان بہادر بہ سپنج گرفت و باخود بہ لکھنؤ برد تا این کلام نا مطبوع را بہ پیرایہ طبع آراید“۔

منشی جی کی دہلی میں غالب سے ملاقات ۱۸۶۱ء میں ہوئی تو دونوں کے درمیاں روابط و مراسم پیدا ہو گئے۔ منشی جی نے غالب کے سفارشی خط پر قدر بلگرامی کو اپنے اسٹاف میں شامل کرایا اور اودھ اخبار میں غالب کے خطوط ان کی کتابوں کے اشتہار کلیات نثر و نظم، قاطع برہان وغیرہ شائع کیں۔ لیکن ان دونوں کی ملاقات سے قبل ہی غالب نے منشی جی کے ایک خط کے جواب میں ان کے کریمانہ اخلاق حسنِ صورت و سیرت سے متاثر ہو کر اپنے خاص انداز میں جو خط لکھا ہے وہ قابل ذکر ہے:۔

”بنام ایزد دانا امروز سخن میگویم با کسی کہ دیدہ رویش نادیدہ است و دل بمہرش گرویدہ ۔ ویدہ دیدار جوئی اوست و روئی دل بسوئی او، بر سر سواد این نامہ کہ از دوست بمن رسید، میان مردم چشم ستیزہ روئی وادہ آن ہمی خواست کہ ہمہ او را باشد و این جستت تا ہمہ بزباید۔ من

درمیان آمدم واز پرخاش باز داشتم، ہریکی بہرہ بر گرفت و آشتی پدید آورد، دیدہ را فروغ مبارک ودل را فراغ ارزانی۔ بسا درپارسی زبان سخن گفتہ ام و سحر نامہ نگاشتہ واکنوں کہ دل ازناتوائی منگالش پر نمی تابد کار بر خود آسان کردہ ام وہرچہ می باید بنشست دراردو می نویسم۔ گوئی کنتار درنامہ فرومی پیچم وبہ دوست می فرستم حاشاکہ درار دو زبان نیز خودرائی وخود نمائی آئین باشد آنچہ بانزدیکاں تواں گفت بادوران نوشتہ می شود ومدعا جان گذارش مدعااست دیگرہیچ۔

ترجمہ : آج میں ایک ایسے شخص سے باتیں کررہاہوں کہ آنکھوں نے اس کا چہرہ کبھی نہیں دیکھا لیکن دل اس کا گرویدۂ محبت ہے۔ مردم دیدہ اس کے دیدار جو ہیں اور دل وجان اس سے محوِ گفتگو۔ اس نامہ کے حسن سواد پر کہ اس نادیدہ دوست کی طرف سے مجھے ملا ہے میری آنکھوں کی پتلیوں اور دل سودا زدہ کی خواہشوں میں ایک جنگ سی چھڑ گئی ہے۔ ایک یہ چاہتا ہے کہ سب کچھ اسے مل جائے اور دوسرے کو خوشی ہے کہ جو ہے وہ اس کے حصہ میں آجائے۔

میں درمیان میں آگیا اور دیدہ ودل کو اس پرخاش سے بازرکھا تا ایں کہ ہر ایک نے اپنا حصہ لے لیا، اور دونوں کے آشتی پیدا ہوگئی۔ چشم کو فروغ مبارک ہو اور دل کو فراغ۔ میں نے فارسی زبان مین ایک زمانہ تک مشق سخن کی ہے اور نادر سحر نامہ لکھے ہیں۔ اب کے دل ناتوانی کے سبب کاوش نہیں کرسکتا۔ میں نے ایک سادہ اور سہل راہ اختیار کرلی ہے اور جو کچھ مجھے لکھنا ہوتا ہے اس کو اردو میں لکھتا ہوں گویا اپنی روزمرہ کی بات چیت کو خط میں لکھ دیتا ہوں اور پرزہ کاغذ کو لپیٹ کر اپنے کسی دوست کو بھیج دیتا ہوں۔

حاشا کہ اردو زبان میں سخن آرائی اور خودنمائی کا کوئی دستور نہیں جو بات نزدیک تر لوگوں سے کی جاسکتی ہے وہی بلا تکلف دوروالوں سے بھی اسی لب ولہجہ مین ہوسکتی ہے

مدعا، عرض مدعا کے سوا کچھ بھی نہیں۔ (پروفیسر تنویر احمد علوی، اوراق معانی ص ۳۱۷)

غالب عمر میں منشی جی سے بزرگ تھے مگر ان کی طبیعت میں جو مروت محبت شفقت کے علاوہ خورد نوازی تھی اس تعلق اور جذبہ کی بنا پر نولکشور صاحب کی ملاقات اور اخلاق کریمانہ نے غالب کو اتنا متاثر کیا کہ وہ انہیں اس مذکورہ بالا خط میں لکھے گئے القاب کے علاوہ شفیق مکرم، لطف مجسم، شفیق دلی، زہرہ صورت اور مشتری سیرت تک سے مخاطب کرتے ہیں وہ اپنی خوشی کو منشی جی کی خوشی سمجھتے ہیں اور انہیں شریک کرکے مزید خوش ہوتے ہیں۔ ایک خط میں لکھتے ہیں :

"منشی صاحب جمیل المناقب منشی نولکشور صاحب کو دولت واقبال، جاہ وجلال روز افزوں نصیب ہو چونکہ احباب کامیابی اور شادکامی احباب سے شاد ہوتے ہیں اس واسطے مجھے ان دنوں میں یاوری اقبال سے ایک امر خوشی کا پیش آیا ہے تو آپ کی خوشی کے واسطے آپ کو لکھتا ہوں بلکہ نظیر ھمدگر کے اتحاد پر تم کو تہنیت دیتا ہوں۔ آپ کو مبارک ہو کہ آخر ماہ گذشتہ کو جو حضرت فلک رفعت نواب معلیٰ القاب لفٹنٹ گورنر بہادر قلمرو پنجاب دہلی میں تشریف لائے تو سہ شنبہ کے دن مارچ ۱۸۶۳ء حال کو اس گمنام گوشہ نشین کو یاد فرمایا اور از راہ بندہ نوازی کمال عنایت سے خلعت کیا" (امیر حسن نورانی م۔ن۔ ص ۶۹)

منشی نولکشور صاحب اودھ اخبار میں وقتاً فوقتاً غالب کے فن شخصیت اور شہرت کے بارہ میں لکھ کر اپنے تعلق کا اظہار کیا کرتے تھے۔ غالب کو انوری اور خاقانی کا ہمسر، فصاحت وبلاغت میں سحبان ثانی، زمین سخن کو آسمان پر پہونچانے والا، لفظ کو اختراوج معانی بنانے والا، اور حال وفکر وطبع عالی لکھا پنج آہنگ کے بعد نہ صرف قاطع برہان چھاپی بلکہ تمام معترضین کے جواب اور ۱۷ اکتوبر ۱۸۶۵ء کے اودھ اخبار کی اشاعت میں داخل کئے اور دوسروں کا منہ اپنی طرفداری سے بند بھی کیا۔

غالب کا میخانہ آرزو ۱۸۴۳ء میں چھپ چکا تھا مزید کہا ہوا اور بقیہ کلام ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کی نظر ہو گیا ضیاء الدین احمد خاں نے بچا کچھا جمع کیا تو منشی صاحب نے اس کا مسودہ لے کر ۱۸۶۱ء میں چھاپنا شروع کیا طباعت کی تاخیر قیمت کے تعین کی بحث میں پڑنے کے بعد ۱۸۶۳ء میں کلیات غالب کا نو لکشور اڈیشن چھپ گیا اودھ اخبار کے یکم جنوری ۱۸۶۲ء اور ۱۳ر مئی ۱۸۶۲ء کی اشاعت میں اشتہار بھی آ گیا۔

کلیات کے سرورق پر مروجہ تشکر باری تعالی کے بعد غالب کی شاعرانہ عظمت بیان کر کے محتویات کلیات اور مطبع نو لکشور کا ذکر اس طرح ہے :

این زبان بعون فیاض مضامین و حسن توفیق خدائی سخن آفریں تعالی شانہ رنگین مجموعہ نتائج فکر بلند زادہ ھائی طبع ارجمند آسمان پیوند، مطلوب بر طالب کلیات غالب مشتمل بر فارسی از قطعات و مثنویات و متضمن قصاید و غزلیات و رباعیات در مطبع خاص منشی نو لکشور دانش آئین رونق افزائی بزم طبع نختین شد۔

دیگر گذشتہ مطبوعات کی مانند کلیات غالب سے متعلق تقریظ مقدمہ، تعارف میں مروجہ فارسی میں کتابت کاغذ، طباعت تصحیح زیبائش حتی حجم اور قیمت کے ذکر کے بعد اسٹاف میں شامل نامور شعرا مانند، اصغر علی خان نسیم مرزا ہادی اشک اور مردان علی خاں رعنا کی کلیات فارسی کی منظوم تاریخ طباعت کا جو اہتمام کیا گیا ہے وہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔یوں تو منتخب اللغات شاہجہانی بہارستان جامی اور شرح ملا صدرا کی عبارتیں اور صاحبان تصنیف سے متعلق خیال آرائی اور قابل یادداشت ہے، لیکن خود کلیات غالب کے طویل تقریظی تعارف کی کچھ تلخیص منشی صاحب، غالب، مطبع نو لکشور اور شعرا کی کاوشیں لائق صد تحسین و آفریں ہے۔

در مطبع فیض منبع گنجور در مردانگی نثار، جواہر خزانگی، فتوت و ہمت را بحر بساحل منشی

نولکشور دریادل بطراز طبع نخستیں رسد ونگار او تسام نوازش گردید۔ حبذا سنجیدہ نظمی کہ چوں تاعقد ثریادر میزان امتحان جاں گرفتہ ایں از سنگینی بزمین ماندہ آں از بے وزنی بآسمان رفتہ از شعر تزئین کہ شیشہ بچشم آفتاب است، گوزلال ہمہ تن آب شد دیوالش بی آب است، قطعاتش خیابا نہائی رنگینی، مثنویہاپر وآغوش دلنشیں، بلند قصاید ظہیر کمال غزلہاش شوخ تراز چشم غزال، ہر مصرعہ دلکش، عدیم المثل ہر فروش بیت الغزل چار مصرع رباعیات شیریں تراز کار او سخن آخیتحان چہار گانہ۔

غرض از حرف تالفظ بقالب دل فریبی ریختہ وجان آدم از سر بالش آویختہ، آرائش این عروس زیبارا بردست ہوشیار کادل فن پیدائست وہادی خشک شعر بید ستگاہ، نابلد بمشاطگی آن بمنشانیست لیکن بحکم المامور معذوری در فرمان پذیری مجبوری بادست رعشہ دار، شانہ در آب داشت، وحسب شعور خودرا بزلف ساختنش برگماشت تامقدور در مقابلہ ہیچ کوتہی نگرددو قدر میسور ازول نہادن پہلو تہی نہ کرد،

مصنف صواب اندیش رادرایں تہذیب ماخویشتن انباز نمود ص ۸ در اشاری کہ رفت بر طبق آن کاربست وپنچہ سلمائی تحقیق رانگار است.

اکنوں ظاہر آنکہ صورتش از نقش ناروا است کہ زیور تیکمیل پوشید، مرصع خلخال از تاریخ پائی زنیس گردید، الہی بر نقطہ خالش نیل بہر چشمہ بدبیں ومردم دیدہ انصاف گزین بادو دامان نگاہ غیب پوش تاپردہ گوش عذر نیوش ساطر ونسیان شواد:

بلند حوصلہ منشی نولکشور امروز	کشادہ بر رخ اہل ہنر در معنی
بطبع تازہ در آورد دفتر منظوم	چکیدۂ قلمی فیض گستر معنی
یگانہ شاہ جہاں سخنور غالب	کہ بر فراشتہ رائب بکشور معنی
چو ختم شد در تعریف، سفت خامہ اش	جلاگرفت زنو طبع گوہر معنی

غرض بلند حوصلہ منشی نولکشور کامل ہنر کے سامنے معانی کے دروازے فیض گستر معانی (غالبؔ) کے کلیات کا طبع کرنا جہان سخنوری کے بادشاہ غالبؔ جن کا علم معانی و بیان کی مملکت پر لہرا رہا ہے، اب جب کہ اشک کے موتی پرونے والے قلم کے توصیفی گہرہائے آبدار ختم ہو رہے ہیں تو گوہر معنی کی تازہ اشاعت نے نئی چمک دمک پائی۔

اختتامیہ گوہر معنی کے خالق مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے شاگرد رشید میر مہدی مجروحؔ کے علم و فضل پر کرنے کے بعد استاد کامل فن خسرو اقلیم، ہمسایہ کلیم، جناب مرزا محمد اصغر علی خاں نسیمؔ کے مندرجہ قطعہ مثنوی نما ابیات پر ہوا ہے اور جن میں منشی نولکشور صاحب کی جملہ خوبیوں کو بروئے سادہ اور شیریں وزن و آہنگ میں بیان کیا گیا ہے:

دلم فدایش کہ ہمت او چو قدرت حق کمی ندارد
کثیر از وہم می سپارد، قلیل از ذرہ می شمارد
نولکشور است نام والاش ہمچو خورشید و ماہ روشن
زیادہ تر از امید گیرد، ہوس گر آرد ہزار دامن
جمال او نور چشم دلہا کمال او یادگار عالم
مزاج از مخزن محبت کشد بدام امید ہر دم
ز حکم او طبع گشت اکنوں، خیال آن بینظیر دوراں
کہ بہر اوصاف حسن فکرش قلم چنین است گوہر افشاں

قطع میں غالبؔ کا نام کلام غالب کے لطیف و زیبا ہونے اور دیوان کی اشاعت غالب کے نام سے ہونے کا بھی ذکر ہے:

چو خوب دیوان کہ در زمانہ از و بلند شد نام غالب
بسال طبعش رقم نمودم لطیف و زیبا کلام غالب

امیر اللہ تسلیم بھی منشی نولکشور کے اسٹاف میں معروف شاعر تھے، چنانچہ طبع دیوان کی تاریخ کو بیان کرنے میں اپنی طبع سلیم اور جادو بیانی کا اظہار کرنے میں پیچھے نہ رہے اور منشی نولکشور صاحب کی مدح خوانی اسی طرح کی جیسے اس وقت کے گورنروں، راجاؤں کے شایان شان کی جاتی تھی اور واقعہ یہ ہے کہ منشی صاحب کے شایان شایان ہے، چھوٹی بحر کی شیرینی ملاحظہ ہو:

زہی ہمت منشی نام جو ۔۔۔ کہ مثلش نیابی درایں چار سو

سراپا چو بخت جوان ارجمند ۔۔۔ چو تدبیر پیران قوی دلپسند

بہ پوشد زمیں سایہ پائی او ۔۔۔ سر بخت و دشمن بود جائی او

چہ نظم نظامی چہ نثر ظہیر ۔۔۔ زطبعش ہمہ گشت شہرت پذیر

منشی جی کے علمی نوادر اور شعری گمنام اور کمیاب نسخوں کی اشاعت کی کوششوں کی طرف تسلیم کا یہ اشارہ مبالغہ نہیں ہے اور پھر غالب اور ان کے کلام کے مرتبہ اور کیمیائی سخن کا بشکل کلیات و دیوان طبع ہونے کا ذکر بھی آخری دو ابیات میں اس طرح ہے۔

کنوں نسخہ کیمیائی سخن ۔ کلام فصیح خدائی سخن

شہ کشور نظم شیوہ زمان خداوند فن غالب خوش بیان (دیوان غالب ص ۵۵۹)

اشک، نسیم اور تسلیم نے منشی نولکشور صاحب کے علمی و ادبی مذاق کا ثبوت ان کی تاریخ میں بھی اپنے منظوموں سے دیا ہے خود منشی صاحب نے اپنی اردو نثر میں جا بجا سعدیؔ، حافظ، مرزا مظہر اور دیگر مشاہیر کے نثری اقتباسات اور اشعار لکھ کر اپنی شعر فہمی، فارسی دانی اور اس سے شغف کا اظہار کیا ہے، کرنل ایبٹ کے سپاسنامہ کے ذکر، ان کے رخصت ہونے پر غم اور پھر واپسی آنے کی آرزو کے اظہار میں حافظ کا شعر بھی قابل ذکر ہے۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعان غم مخور ۔۔۔ کلبۂ احزان شود روزی گلستان غم مخور

ص ۱۶

کند ہر کسب بقدر خویشتن منت گزاریھا زیاران تحفہ دیگر ز مظہر جانسپاریھا ص ۲
بسفر رفتنت مبارکبار بسلامت روی و باز آئی ص ۱۶
ای خرم از فروغ رخت لالہ زار عمر باز آ کہ رفت بے گل رویت بہار عمر

امیر حسن نورانی مرحوم نے اپنی کتاب منشی نو لکشور میں بھی منشی صاحب کے اشعار اور دوسرے اقتباسات نثر و نظم سعدی وغیرہ کے پیش کئے ہیں اور پھر مجموعی حیثیت سے منشی صاحب کی خدمات کااعتراف یوں کیا ہے۔

"منشی نو لکشور کو ملک میں بہت ہر دل عزیزی نصیب ہوئی، ہندو، مسلمان، سکھ، عیسائی، سبھی قدر منزلت کرتے تھے۔ ان کے ساتھ کام کرنے والے عوام و خواص ان سے بڑی عقیدت اور محبت سے پیش آتے تھے، اہل علم ان کو وقعت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ان کی مدح میں شعرا نے طول طویل قصاید اور نظمیں بھی لکھیں ہیں، ان سب کو جمع کیا جائے تو ایک مبسوط کتاب مرتب ہو سکتی ہے ان کی خوش اخلاقی کا ہر ایک مداح تھا، بقول غالب خدا نے ان کو حسن صورت اور حسن سیرت دونوں سے نوازا تھا۔ ان کی ذات ہندو مشترکہ تہذیب کا معیاری نمونہ تھی" (امیر حسن نورانی منشی نو لکشور ص ۷۹)

غرض ان دو نادرہ روزگار شخصیتوں میں جن میں سے ایک مسلمان اور دوسرا ہندو تھا، نظریاتی ہم آہنگی، علمی و ادبی خدمت، اور اردو ادبیات کا عطیہ تھا۔ ہم آہنگی، صلح کل، آدمیت اور بھائی چارہ کی فضا ہموار تھی اور گبر و مسلمان کے سارے نفاق دور کرنے کا سبق پڑھایا تھا۔ آج غالب کے پڑھنے والوں اور منشی نو لکشور صاحب کے جاننے والوں کا فرض عین ہے کہ وہ ان دونوں کی فکر، عمل، ایثار، علم دوستی اور انسانیت و ہمدردی کے نظریات و جذبات کو تبلیغ اور تشہیر کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کریں اور غالب اور منشی نو لکشور صاحب کے مشترکہ تمدن کی روشن کی ہوئی شمع کو، تعصب، فرقہ واریت اور نفرت کی تند و تیز

آندھی سے بچا کر پورے ملک کو تباہی اور تاریکی کے غار میں جانے سے بچالیں

کتابیات

۱۔اردو کے اخبار نویس امداد صابری — صابری اکیڈمی، چوڑیوالان، دہلی ۱۹۷۳ء

۲۔اردو کے تصنیفی اور تالیفی ادارے — ڈاکٹر دیوانند گپتا گلشن پبلیکیشنز سرینگر ۱۹۸۷ء

۳۔اوراق معانی پروفیسر تنویر احمد علوی — اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۲ء

۴۔پنج آہنگ — کالی داس رضا گپتا، ومل پبلکیشنز بمبئی

۵۔کلیات غالب — غالب مطبع نولکشور لکھنؤ ۱۸۶۳ء

۶۔غالب غلام رسول مہر — دہلی اڈیشن ۱۹۳۶ء

۷۔منشی نولکشور (احوال وخدمات) — امیر حسن نورانی۔مکتبہ صبح، اردو بازار دہلی ۱۹۸۲ء

ہندوستانی پریس نادر علی خان — اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ ۱۹۹۰ء

منشی نولکشور
خادم علم و دانش ، محسن انسانیت

پروفیسر ع. و. اظہر دہلوی
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

قمریاں پاس غلط کردۂ خود میدارند
ورنہ یک سرو دریں باغ بہ اندام تو نیست

مشرقی علوم کے مطالعہ میں جو مرکزی حیثیت فارسی اور اس کے مطالعہ کو حاصل ہے شاید کسی دوسرے علم کو نہ ہی کیفیت کے اعتبار سے اور نہ ہی کمیت کے اعتبار سے حاصل ہے۔ ایک طرف اس کے ڈانڈے زبان اور ثقافت میں ہند شناسی سے ملے ہوئے ہیں تو، دوسری جانب اس کا بہت گہرا تعلق عربی اسلامیات سے ہے۔ وہ عرب میں یونانی فلسفہ سے لین دین کرتی ہوئی نظر آتی ہے تو دوسری طرف مشرق میں دیوار چین کے اس طرف داخل ہو گئی ہے۔ مانی ازم کا اثر صرف نقاشی تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ دوسرے شعبوں کو بھی اس نے متاثر کیا۔ فارسی زبان، ادب اور کلچر کے علاوہ تصوف کی وجہ سے فکر و فلسفہ میں غیر معمولی مقام حاصل کئے ہوئے ہے۔

ہندوستان نے فارسی کی جو خدمات انجام دی ہیں اتنی جہانِ فارسی کے سارے ملک ملکر بھی انجام نہیں دے سکتے ہیں۔ بعض میدانوں میں ہندوستان کے دانشور اور عالم اہل زبان سے بھی آگے ہیں۔ اس میں صرف اخبارات کی اشاعت، لغت کی ترتیب و تدوین، انشاء کی کتابیں، موسیقی میں تصانیف ہی نہیں ہیں بلکہ سائنسز اور علوم کی وہ شاخیں جن پر بعد کے دور

میں ہندوستان میں ہی تجربات کئے گئے اور وہ آج کی سائنس کی تاریخ کا اہم باب ہیں۔ ہندوستان میں فارسی علوم ومطالعات کی کون سی ایسی شاخ ہوگی جس پر اہل علم تحقیقی کام کریں، طالب علم اسکو اپنا موضوع مطالعہ قرار دیں اور اس پر منشی نولکشور کے مطبع کی مہر نہ لگی ہو، بلاواسطہ یا بالواسطہ علم کو اس نسل تک پہنچانے میں منشی نولکشور کے مطبع نے کوئی حصہ نہ لیا ہو۔

فارسی زبان وادب اور کلچر کے کسی بھی طالب علم کے لئے چاہے وہ دنیا کے کسی بھی گوشے میں رہتا ہو اگر وہ تحقیق کا کام کریگا تو یقیناً اسکی آشنائی منشی نولکشور سے بھی ہوگی کتاب کے پہلے صفحے پر ہی در مطبع منشی نولکشور لکھنؤ / کانپور انطباع یافت / طبع شد اور جب وہ کوئی بھی کتاب ختم کریگا تو یقیناً آخر میں بھی ان کی مساعی اور کوششوں کا اعتراف ہوگا۔ تاریخ طبع منظوم ہوگی آج جب طباعت واشاعت بہت ہی آسان ہوگئی ہے، اس میں نئی نئی مشینوں کی وجہ سے کم وقت میں کم لاگت کے ساتھ اشاعت و تقسیم کے زیادہ مواقع حاصل ہیں، لیکن جب ہم گذرے ہوئے کل پر نظر ڈالتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کتابوں کو چھاپنا اور کم قیمت پر بیچنا اور کسی بھی قیمت پر شکست تسلیم نہ کرنا، ہار نہ ماننا منشی جی کا مطمح نظر رہا ہوگا۔ مرزا غالب جیسے تنک مزاج نے بھی ان کی صورت وسیرت دونوں کی ہی تعریف کی ہے۔

بر سیرت لطیف تو گفتار تو دلیل
بر نسبت شریف تو کردار تو گواہ

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد ہندوستانیوں کی ہمتیں پست اور حوصلے ٹوٹ گئے تھے۔ سب اپنی جانیں بچانے کی فکر میں پڑے ہوئے تھے علوم وفنون کی طرف کون متوجہ ہوتا۔ ساسنی ضلع علی گڑھ میں پیدا ہونے والے ایک نوجوان کی دور اندیش آنکھوں

نے دیکھ لیا تھا کہ یہی وقت ہے عملی کام کرنے کا۔ چنانچہ آگرہ سے منتقل ہو کر لکھنؤ کو انہوں نے اپنا مرکز بنایا اور "اودھ اخبار" کے پندرہ روزہ پرچہ سے صحافت شروع کرنے والے منشی نولکشور اسلامی علوم، فارسی اور ہندوستانی علوم کے گرانقدر خزانہ کو بچانے میں کامیاب ہو گیا ایک آنہ اور دو آنہ کی قیمت پر چھوٹے چھوٹے رسالے بیچنے والے کا نام ہندوستان گیر بلکہ جہاں گیر ہو گیا۔ مشرقی ممالک کے ہر مدرسہ میں ان کی چھاپی ہوئی درسی کتابیں، بچے پڑھ پڑھ کر عالم ہوئے اور مغربی ممالک کے اہل علم کی علم دوستی اور دانش پروری نے جب مشرقی ذخیروں کو ٹٹولا، کتابوں کو یوروپ لے گئے وہاں کے کتابخانوں میں محفوظ کیا تو سب سے زیادہ مقبول نام منشی جی کا ہی تھا۔ وہ ہر حوالہ میں دیا جاتا تھا۔ جو کام کئی کئی اکاڈمیاں ملکر انجام نہیں دے پاتی ہیں وہ اس مرد عمل نے اپنی کوشش اور کاوش سے ۳۷ برس میں انجام دیدیا۔ مطالعات فارسی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہیں جو منشی نولکشور کی فہرست میں شامل نہ ہو ادب میں شعر ونثر میں فردوسی سے لیکر حزیںؔ، قتیلؔ، مرزا غالبؔ، بیدلؔ پھر ان میں سے کچھ کے اردو ترجمے، ہندی انواد، شرحیں، الفاظ کی فرھنگیں، تاریخ تذکرے اور سیرت، تصوف وسلوک، مذہب اور اخلاق، لغت وفرھنگ، طب، نجوم، ھئیت۔ ان کی خدمت کا دائرہ صرف ان کتابوں کو چھاپ کر شائقین تک پہنچانا ہی نہیں تھا بلکہ وہ ان کی شرحیں لکھواتے۔ اہم کتابوں کے ترجمے اردو ہندی میں کراتے۔ سنسکرت اور ہندی کے ترجم فارسی میں قدیم علماء کے کئے ہوئے موجود ہیں ان سب کو زیور طبع سے آراستہ کیا۔

اگر ہم بہ نظر غائر منشی جی کے ان کاموں کا جائزہ لیں تو اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ:

۱۔ منشی جی نے اس ملک کی سب سے اہم ضرورت کو پیش نظر رکھ کر قومی اتحاد کو افہام و تفہیم کے ذریعہ سے مضبوط کیا۔ ظاہر ہے جو چیز علم کے ذریعہ سے حاصل ہوتی ہے وہ دیرپا بھی ہوتی ہے اور اسکی جڑیں گہری ہو جاتی ہیں۔ یہ عمل مغلیہ سلطنت کے زمانہ میں خصوصی

توجہ سے شروع ہوا۔انگریزوں نے اپنی مصلحت کی بناء پر اسکی رفتار سست کرنی چاہی لیکن منشی جی نے مثبت اور تعمیری رویہ اپنایااور اسکو تقویت بخشی۔بعد اور دوری کو علم و آگہی سے ہی دور کیا جا سکتا ہے۔

۲- ہندوستانیوں کی علمی خدمات کا اعتراف اور اظہار :۔ یہاں کے علمی ذخیرے کی حفاظت اور اسکی نشر و اشاعت۔

۳- ہندوستان کے متوسط دور میں جس روایت کی بنیاد پڑی تھی اور اب اسکے پروان چڑھنے کا زمانہ آیا تھا یعنی سیکولرازم کی روایت، ہندو مسلم دوستی کی روش جس میں فارسی نے بہت ہی اہم رول ادا کیا ہے۔اس نے اپنا تعلق سب سے برقرار رکھا وہ تہذیبی زبان رہی اس نے یہاں کے کلچر کو دیا بھی اور اس سے لیا بھی چنانچہ اسکا دامن بہت ہی وسیع ہو گیا اور ہندوازم کے طرز فکر، فلسفہ اور ریاضت کے موتیوں سے اپنا دامن بھر لیا یہاں کی داستانیں، کہانیاں، اساطیر، اور عشقیہ قصے اس کی روایت میں شامل ہو گئے۔ منشی جی نے فارسی کے حوالے سے اسکو بہت آگے بڑھایا۔ راماین، مہابھارت، بھگوت گیتا امرت ساگر، رسائل شنکر آچاریہ ان کو فارسی میں چھاپا، ہندی اور اردو میں منتقل کرایا۔ہندی کی وہ کتابیں جو فارسی رسم الخط میں تھیں ان کو بھی چھپوایا۔

۴- یہاں کے اہل علم و دانش جو جنگ آزادی میں شکست کے بعد مایوس ہو گئے تھے ان کی سرپرستی ان کی حوصلہ افزائی کر کے ان کو تشویق دلا کر ان سے اہم علمی کام کرائے۔

۵- تجارتی اصولوں پر اہل لکھنؤ و کانپور طباعت و اشاعت کے کاموں کی تربیت اور چھوٹے چھوٹے چھاپہ خانے اور مطبع قائم ہو گئے کہ بعض ان میں سے اور بڑے ہو گئے ایسا لگتا ہے کہ جیسے آصف الدولہ کے بارے میں مشہور ہے کہ امام باڑے کی عمارت رات بنواتے تھے تاکہ عزت دار لوگ آ کر کام کرنے میں عار نہ محسوس کریں اور محض سرپرستی کی خاطر صبح وہ اسکو گروا دیا کرتے تھے تاکہ لوگوں کو روزی ملتی رہے اور وہ کام پر لگے رہیں، منشی جی نے تقریباً

سوہینڈ پریس مختلف کاریگروں کو دے دیے اور مسودے چھاپنے کے لئے دیدیتے اور پھر آدھی رقم اجرت میں دیتے اور آدھی قیمت میں کاٹ لیتے اس طرح بہت ہی کم مدت میں وہ چھاپہ خانہ قائم ہو جاتا اور مشین اسکی ملکیت۔

۶-ہندوستان اور لکھنؤ کا تعارف ایک علمی سرزمین کی حیثیت سے:۔ آس پاس کے ملکوں میں وہاں کے بچوں کے ہاتھوں درسی کتابوں پر مطبع منشی نولکشور کا نام ہوتا تو غائبانہ طور پر لکھنؤ اور منشی جی کے لئے ان کے دل میں ایک عقیدت اور ارادت کا پیدا ہو جانا قدرتی بات ہے جو کام آجکل ICCR انجام دیتی ہے یا ہمارے سفارت خانوں میں کلچرل کاؤنسلران کو کتنی کامیابی ملتی ہے اس کا اندازہ تو ہماری وزارت خارجہ کے لوگ جانتے ہونگے، لیکن Area Study کے ایک طالب علم کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ منشی جی کے اس پریس نے اور ان کے اس اہتمام والتزام نے ہمارے سفارت خانے کے کام کو مشرقی ملکوں میں تو بہت ہی آسان کر دیا ہے اور علمی کلچرل روابط ایسی مضبوط بنیادوں پر قائم کر دیئے ہیں کہ تقریباً تین نسلیں لکھنؤ اور مطبع منشی نولکشور سے بخوبی واقف ہیں۔

منشی جی کو اس مطبع سے مادی فائدہ بھی ہوا کہ وہ کروڑوں کی جائید وارثین کے حوالے کر کے گئے، لیکن ان کا مطمح نظر دولت کمانا کبھی بھی نہیں تھا بلکہ ان کی دولت تو وہ معنوی دولت تھی جس کو پروان چڑھتے انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ایک برہمن زادے اور قرآن کی طباعت کے لئے اتنا اہتمام وہ ہندوازم کی تعلیمات پر چلتے ہوئے بھی اسلام اور مسلمانوں کے مخدوم بن گئے۔

خیال بانیک وبدعرفی بسر کن پس مردن

مسلمانت بزمم حزم شوید وہندوبسوزاند

کاش ایسا ممکن ہوتا کہ حکومت ہند ایران، افغانستان اور سنٹرل ایشیا کی چھ کی چھ

نو آزاد مملکتوں، مغربی ایشیا کی عرب ریاستوں کو ہم خیال بنا کر UNESCO سے درخواست کرے کہ ہر پانچ سال بعد وہ کسی ایسے ادارہ کو ایک منشی نو لکشور انعام سے نوازے جس نے اس مدت میں علم و دانش کے ذریعہ سے دنیا والوں کے درمیان بہتر افہام و تفہیم پیدا کی ہو تاکہ منشی جی کے قرض کا ہم لوگ صرف سود ہی ادا کر پائیں۔

آوازۂ خلیل زبنیاد کعبہ نیست
مشہور شداز آنکہ در آتش نکو نشست

یوں تو منشی نو لکشور کا نام سفینوں سے نکل کر سینوں میں محفوظ ہے لیکن زندہ قومیں اسی بھی پر بس نہیں کیا کرتی ہیں وہ اپنے محسنوں کی نیکیوں کا اعتراف ان کے احسانوں کا اقرار کھلے دل سے کرتی ہیں آج سے چند سال قبل آل انڈیا پرشین ٹیچرز کانفرنس نے لکھنؤ کی کانفرنس کے موقع پر ایک ریزولوشن پاس کیا تھا کہ لکھنؤ یونیورسٹی میں ایک چیئر فارسی میں منشی نو لکشور کے نام پر قائم ہو۔ معلوم نہیں اس میں کچھ ہوا یا نہیں۔ ہماری خوش قسمتی کہ آجکل اتر پردیش کے گورنر ایک علم دوست فارسی داں ہیں، وہ یونیورسٹی میں چانسلر کی حیثیت سے اس تجویز کو عملی جامہ پہنا کر فارسی داں عربی کے عالموں، اسلامیات کے ماہروں اور سنسکرت وہندی کے وِدّوانوں کو شکریہ کا موقعہ بھی دینگے اور منشی جی کا قرض جو ہندوستانیوں اور لکھنؤ پر ہے اسکو اتارنے کی کوشش بھی کرینگے۔

لکھنؤ کے مطابع میں منشی نولکشور کا مقام

پروفیسر محمد اسلم خاں
دہلی یونیورسٹی

ہندوستان کا عظیم الشان شہر لکھنؤ جہاں ایک طرف اودھ کی تہذیب وتمدن اور ثقافت کا مرکز اور علم وادب کا گہوارہ رہا، وہیں صنعت وحرفت میں بھی پیش پیش رہا ہے۔ صنعت وحرفت کے میدان میں لکھنؤ کی برتن سازی، سادہ کاری اور انگرکھے دوزی دنیا بھر میں مشہور ہے، صحافت میں بہت سے اخبار اور رسالے منظر عام پر آئے اور اپنی شعری ونثری تخلیقات سے اردو فارسی ادب کو مالا مال کیا۔ طباعت نے نہ صرف ان کے کارناموں کو بلکہ دوسرے مشاہیر کے شاہکاروں کو زیور طبع سے آراستہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے علم کی شمع کو فروزاں کر دیا۔ اپنے اس مختصر مقالہ میں لکھنؤ کے چند مطابع کے مختصر تعارف کے بعد منشی نولکشور کی شخصیت اور کارناموں نیز ان کے مطبع پر روشنی ڈالی ہے۔

مطابع کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں تقریباً بیس بائیس پریس مختلف ادوار میں قائم ہوئے جن میں سے بعض، ایک مدت کے بعد ختم ہو گئے۔ بعض کے نام تبدیل ہو گئے۔ لکھنؤ کی تاریخ میں جن مطابع کا ذکر ملتا ہے، ان میں سے چند اہم مطابع کا تعارف پیش ہے۔ [1]

مطبع ولی محمد : یہ پریس بانس کی سرائے میں قائم تھا۔ اس پریس سے شائع ہونے والی کتابیں دیدہ زیب ہونے کے ساتھ ہی ساتھ طباعت کی صحت کے اعتبار سے اہمیت کی حامل تھیں۔

مطبع مصطفائی : تیرھویں صدی ہجری کا مشہور پریس محمد مصطفیٰ خان ولد حاجی روشن خان نے محلّہ محمود نگر زیر اکبری دروازہ قائم کیا تھا۔ اس پریس سے عام طور پر درسی کتابیں چھپتی تھیں۔ محمد مصطفیٰ خان کے بارے میں کہا جاتا ہے:

"مصطفیٰ خان شیشے کے بڑے تاجر تھے۔ پتھر پر معکوس لکھنا، انہی کی ایجاد ہے۔ اصلاح سنگی کو فروغ بھی مصطفیٰ خان نے دیا"

۱۲۹۵ھ میں یہ مطبع بڑی کامیابی کے ساتھ طباعت کے کام انجام دے رہا تھا مصطفائی پریس کی بعض مطبوعات پر محمد زکریا نامی ایک فاضل شخص کے حاشیہ بھی ملتے ہیں۔

مطبع مرتضوی : لکھنؤ کا ایک دوسرا معروف پریس محمد نصیر الدین دہلوی نے محمود نگر متصل چاہ سرخ پر جاری کیا تھا۔ پریس میں فن کتابت کے ماہر مولوی الٰہی بخش کا نام ملتا ہے جن کو خط نسخ اور خط نستعلیق لکھنے میں مہارت حاصل تھی اور مولوی صالح شوق تصحیح کے فرائض انجام دیتے تھے۔

مطبع چشمۂ فیض : اسی علاقہ میں ایک دوسرا پریس مطبع چشمۂ فیض کے نام سے نادر حسین خان نے ۱۲۹۶ھ میں قایم کیا۔

مطبع محمدی : امام باڑہ بادشاہ محل میں حاجی ولی محمد نے ایک بڑا پریس مطبع محمدی کے نام سے قایم کیا۔ اس پریس سے ایک قرآن مجید کے سو نسخوں کی طباعت ضیاء الدولہ مظفر الملک نواب کاظم علی خان ذوالفقار جنگ کی خواہش پر عمل میں آئیں یہ قرآن کریم طباعت کے لحاظ سے اس پریس کا شاہکار تھا۔

مطبع اسدی : لکھنؤ کا ایک اور پریس جس کی چھپی ہوئی کتابیں دستیاب ہیں، مطبع اسدی جھوائی ٹولہ میں تھا۔

مطبع علوی : مطبع علوی کٹرہ محمد علی میں علی بخش خان ولد پیر محمد خان نے قایم کیا تھا اس پریس کی چھپی ہوئی کتابیں طباعت کے لحاظ سے بہت نفیس اور عمدہ ہوتی تھیں حتی کہ:

"اس کے مطبوعات کی نظیر، پریس کا نیا دور اور الیکٹرک سے چلنے والے برقی پریس پیدا نہیں کرسکے" [۲] مطبع علوی کے پریس میں حیدر علی، امام بخش اور امام الدین کا نام قابل ذکر ہے۔ فقہ امامیہ کی مشہور کتاب شرائع اسلام اسی پریس سے چھپی تھی۔

مطبع سبحانی : لکھنؤ کے کشمیری محلہ میں مسیح الزماں ولد نور محمد نے مطبع سبحانی قایم کیا تھا جس کی ۱۲۶۴ھ تک کی چھپی ہوئی کتابیں بعض لائبریریوں میں مل جاتی ہیں۔

مطبع کنز العلوم : کنزالعلوم پریس امام باڑہ غفرانمآب میں انگریزوں کے تسلط کے بعد قایم ہوا۔ اس پریس کے ناظم منشی سید اسمٰعیل حسین منیر شکوہ آبادی تھے۔

تمنائی پریس : منشی رام سہائے تمنا نے نوبستہ میں تمنائی پریس اپنے نام پر جاری کیا تھا۔ صوبہ اودھ کے حالات پر دو مہینہ کی مختصر مدت میں تاریخ لکھ کر اسی پریس سے احسن التواریخ کے نام سے چھاپی۔ اس کتاب کے بارے میں تمنا خود کہتے ہیں:

نہ رنگین عبارت نہ عمدہ کلام ☆ یہ تاریخ دو ماہ میں کی تمام [۳]

تمنائی پریس سے ایک ہفتہ وار اخبار ۲۰ ستمبر ۱۸۸۲ء مہر ظرافت [۴] کے نام سے شائع ہوا۔

مطبع مظہرالعلوم : لکھنؤ کی گنجان بستی محلہ پیر بخارا میں مظہرحسین نے مطبع مظہرالعلوم قایم کیا ۱۲۱۳ھ میں دعائے صباح کلام حضرت امیرالمومنین علی مرتضی رضی اللہ عنہ کا وہ اڈیشن طبع ہوا جو اسداللہ خان غالب کے منظوم ترجمہ دعا کا شاہکار اور لکھنؤ کے مشہور خوشنویس مجو کاتب کی یادگار ہے۔ [۵]

چھاپہ خانہ : ایک پریس ۱۲۵۹ھ میں شیش محل میں قایم ہوا جس کے مالک محمد حسین تھے اس پریس میں عبدالرحمٰن نامی کاتب موجود تھے جو خط نستعلیق میں بہترین کتابت کرتے

تھے۔

مطبع اصغری : جس کا دوسرا نام مطبع مسیحائی تھا جو مولوی نور محمد کے زیر اہتمام محلّہ بیگم گنج میں جاری ہوا۔

مطبع گلزار اودھ : خدا بخش بنارسی کی زیر نگرانی حافظ محمد باقر چلاتے تھے۔ ۱۲۸۳ھ تک کی اس پریس کی چھپی ہوئی کتابیں مل جاتی ہیں۔ بعد میں اس پریس کی جگہ مطبع تیغ بہادر قایم ہوا۔

مطبع کارنامہ : محمد یعقوب انصاری نے نواب محسن الدولہ بہادر کے عہد میں محلّہ گولہ گنج میں یہ پریس قایم کیا۔

مطبع آئینہ حق نما : لکھنؤ کا ایک اور پریس مطبع آئینہ حق نما تھا جس کی ۱۲۸۰ھ تک کی مطبوعات لائبریریوں میں ملتی ہیں۔

جعفری پریس : خاص بازار کا ایک پریس جس کی ۱۲۶۲ھ تک کی چھپی ہوئی کتابیں چند لائبریریوں میں مل جاتی ہیں، محمد جعفر کے زیر اہتمام جاری تھا۔

انگریزی حکومت کے قیام کے بعد عموماً اور منشی نو لکشور کے پریس کے قیام کے بعد خصوصاً پرانے پریس یکے بعد دیگرے ختم ہوتے گئے۔

ہندوستان کی مشترک تہذیب کے بہترین نمایندہ، سیکولرزم کے دلدادہ، ادب پرور، انسان نواز اور بشر دوست منشی نو لکشور ۱۸۳۶ء میں پیدا ہوئے۔ اردو فارسی تعلیم حاصل کرنے کے بعد اپنا بیشتر وقت، وہ اخباروں اور رسالوں کے مطالعہ میں صرف کرتے تھے۔ سولہ سال کی عمر میں ایک اخبار نکالنا شروع کیا۔ کچھ عرصہ بعد نو لکشور نے لاہور کے کوہ نور پریس میں ملازمت اختیار کی۔ دوران ملازمت اپنا پریس قائم کرنے کا خیال آیا لہٰذا کوہ نور پریس کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر، آگرہ چلے آئے اور ۱۸۸۵ء میں حضرت گنج کا ایک چھوٹا پریس جس کے بانی اس کو بند کرنا چاہتے تھے، نو لکشور نے حاصل کر لیا اور اپنا پریس قایم

کیااور معقول سرمایہ لگا کر اس کو مستحکم کر دیا۔ رفتہ رفتہ اس مطبع نے ترقی کی اور فروغ حاصل کیا۔ کچھ عرصہ بعد اس پریس کی شاخیں لاہور، پٹیالہ، اجمیر، جبل پور اور کانپور میں قایم کردیں۔ اس کے علاوہ کلکتہ اور کچھ دوسرے شہروں میں اپنے پریس کے دفتر کھول دیئے، منشی نول کشور کا ارادہ تھا کہ لندن میں پہلے ایک کتاب فروشی کی دوکان کھولیں بعد میں اسی کو پریس کی ایک شاخ میں تبدیل کر دیں لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور ۱۸۹۵ء میں ان کا انتقال ہو گیا۔

منشی نول کشور فارسی اور اردو کے سرکردہ عالم تھے۔ انھوں نے اپنے پریس کے قیام کے بعد پہلے فارسی کی درسی کتابوں کی طرف توجہ دی، جب پریس نے ترقی کی تو انہوں ادبیات فارسی کے اس غنی سرمایہ کی طرف توجہ دی، جو ہندوستان کے مختلف مقامات پر قلمی نسخوں کی شکل موجود تھا۔ انہوں نے علمی، ادبی، تاریخی اور دوسرے علوم کے قلمی نسخوں کی طرف توجہ مبذول کی اور ہر ممکنہ صورت سے ان کو حاصل کرنا شروع کیا۔ کچھ قلمی نسخے دور افتادہ مقامات پر ادب دوست حضرات کے ذاتی ذخیروں میں موجود تھے، ان حضرات سے تعاون کی درخواست کی۔ اپنے نمایندوں کو ان کے پاس بھیج کر کسی نہ کسی طرح ان کے حصول کی کوشش کرتے اور پھر ان کی تصحیح اور ترتیب کے لئے کوشش کرتے۔ اس طرح مطبع نولکشور سے فارسی شعرا کے کئی دواوین زیور طبع سے آراستہ ہوئے۔ اس کے علاوہ بے شمار کتابیں مثلاً شاھنامہ فردوسی، دیوان حافظ اور گلستان سعدی متعدد بار منشی نولکشور کے پریس سے منتشر ہوئیں۔

منشی نولکشور سیکولرزم کے حامی اور دلدادہ تھے، ہر مذہب کا احترام اور عزت ان کا شعار تھا۔ مختلف ادیان کی مقدس کتابیں جیسے راماین، گیتا، قرآن مجید وغیرہ ان کے پریس سے شائع ہوئیں۔ قرآن مجید کی طباعت کے سلسلہ میں احترام اور تقدس کا خاص خیال رکھتے، حتی کہ جس جگہ کتابت اور طباعت ہوتی، کاتب حضرات پاک صاف اور باوضو جایا

کرتے تھے۔ زبدۃ العلماء سید آغا مہدی منشی نولکشور کے بارے میں رقمطراز ہیں:-

''انصاف پسند طبقہ آج یہ رائے قایم کرنے پر مجبور ہے کے نولکشور کا مسلمانوں پر خصوصی احسان ہے کہ انہوں نے سنی و شیعہ لٹریچر اس وقت چھاپنا شروع کیا جب عیسائیت اسلام کو کچلنے کے سامان کر رہی تھی''۔[6]

چنانچہ نولکشور کے مطبع سے اسلامی اور دینی علوم پر جیسے قرآن مجید مختلف سائزوں میں نیز اردو فارسی ترجمہ کے ساتھ ،ادعیہ واذکار میں دلائل الخیرات و جواہر القرآن، تفسیر پر تفسیر حسینی، اسلامی تاریخ، تصوف واخلاق پر شرح وقایہ، فتوح الحرمین، فقہ پر عین الہدایہ وغیرہ زیور طبع سے آراستہ ہوئیں۔

منشی نولکشور کی خدمات صرف کتابوں کی طباعت تک محدود نہ تھیں، بلکہ انہوں نے اپنے پریس میں مختلف دینی کتابوں کے تراجم کی مدد سے ہندوستان کے مختلف ادیان اور مذاہب میں ایک قومی اتحاد کے جذبہ کو فروغ دینے کی کوشش کی۔ اس کام کو انجام دینے کے لئے ہندوستان کے گوشے گوشے سے ممتاز علما اور مترجمین کا انتخاب کیا، جنہوں نے عربی، فارسی، ہندی اور اردو کی کتابوں کے ترجمہ کا کام انجام دیا نیز ان زبانوں کی متعدد کتابیں انگریزی میں ترجمہ ہوئیں۔

منشی نولکشور انسان دوست اور غریب پرور تھے۔ پریس کے قیام کے آغاز کے وقت دستی مشینیں استعمال ہوتی تھیں، ان کے پریس میں تقریباً سو سے زیادہ دستی مشینیں تھیں۔ ہر دستی مشین کے لئے ایک نگراں اور اس کا مددگار ہوتا۔ جب بھی نگراں اپنی مشین پر اچھی طرح مہارت پیدا کرلیتا، منشی نولکشور اس شرط کے ساتھ دستی مشین اس کے سپرد کر دیتے اور اس کے گھر پر لگوادیتے کہ طباعت کا کام ان کے پریس سے حاصل کرے۔ آمدنی میں سے آدھی رقم اس کو دیدیتے اور آدھی رقم مشین کی قیمت کے طور پر وضع کر لیتے۔ اس خیر خواہانہ قدم کا نتیجہ یہ ہوا کے تھوڑے ہی عرصہ میں یہ معمولی لوگ پریس کے مالک بن

گئے اور لکھنؤ میں چھاپہ خانوں کی تعداد میں قابل ملاحظہ اضافہ ہوا۔

انسان دوستی کے ناطے منشی نو لکشور نے طب کی کتابوں کی اشاعت کے سلسلہ میں خصوصی توجہ دی۔ شب و روز کی کاوشوں اور پیہم کوششوں کے بعد منشی نو لکشور نے ممتاز اور نامور طبیبوں کے عربی اور فارسی قلمی نسخوں کو حاصل کیا اور ماہر طبیبوں کو ان کی تصحیح و ترتیب کے لئے مامور کیا نیز ان کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرایا۔ بو علی سینا، حکیم زکریا رازی، اور حکیم محمد اکبر ارزانی کے شاہکاروں کی طباعت کا انتظام کیا۔ مطبع نو لکشور کی طرف سے حکیموں اور طبیبوں کو مقرر کیا جو غریبوں اور ناداروں کا علاج کرتے تھے۔ علم طب کے استادوں اور طلبا کے لئے تدریسی سہولیات فراہم کیا، تاکہ وہ اس میدان میں اعلیٰ تعلیم و تحقیق کے کام انجام دے سکیں۔

منشی نو لکشور نے ۱۸۵۸ء میں پریس قایم کیا اور ۱۸۹۵ء میں ان کا انتقال ہوا اس طرح وہ ۳۷ سال مطبع کے نشر و اشاعت کے کام سے وابستہ رہے۔ ۳۷ سال کے اس مختصر عرصہ میں قرآن مجید، فن تفسیر قرآن، فن حدیث، فن فقہ، اصول فقہ، علم اخلاق، علم تصوف، سیرت، تاریخ، کلام، حکمت و فلسفہ، ہئیت، بلاغت، منطق، صرف و عروض و قوافی، علم ریاضی و ہندسہ، موسیقی، ادب و انشا، نجوم و رمل، طب یونانی، فرہنگ و لغت وغیرہ پر دو ہزار سے زیادہ کتابیں مطبع نو لکشور سے طبع ہوئیں۔

۱۔ تاریخ لکھنؤ از زبدۃ العلماء سید آغا مہدی، چاپ کراچی، ۱۹۷۶ء، ص ۹۲
۲۔ تاریخ لکھنؤ ص ۱۰۸
۳۔ تاریخ لکھنؤ، ص ۱۷۳
۴۔ نیا دور دسمبر ۱۹۵۹ء
۵۔ تاریخ لکھنؤ، ص ۱۹۴
۶۔ تاریخ لکھنؤ، ص ۳۹۳

نولکشور پریس کی مطبوعہ فارسی کی پہلی درسی کتاب

پروفیسر شریف حسین قاسمی

دہلی یونیورسٹی

عربی فارسی کے اساتذہ طلباء اور قارئین کے ذہن میں جب منشی نولکشور کا نام آتا ہے، تو احترام سے سر جھک جاتا ہے۔ منشی نولکشور کی بے لاگ اور پر خلوص مساعی کا نتیجہ ہے کہ خاص طور پر ہم فارسی کے طلباء آج دنیائے فارسی میں فخر سے یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ فارسی کی بے شمار کتابیں سب سے پہلے ہندوستان سے شائع ہوئیں۔ ایسی متعدد کتابیں آج بھی دنیا کے معروف کتاب خانوں کی زینت ہیں۔

بارہا ایران جانا ہوا ہے۔ وہاں بڑی تعداد میں ایسے لوگوں سے ملاقات ہوئی ہے جو منشی نولکشور پریس کی فارسی اور عربی مطبوعات سے آج بھی استفادہ کرتے ہیں اور فارسی زبان و ادب کو انیسویں صدی میں تمام جہان فارسی میں زندہ رکھنے اور اسے رواج دینے میں منشی نولکشور اور ان کے مطبع کے مساعی جمیلہ کے معترف ہیں۔ اگلا سوال یہ ہوتا ہے کہ نولکشور پریس اب کیوں کام نہیں کر رہا ہے؟ صرف یہی جواب دیا جاسکتا ہے کہ خاص طور پر ہم ہندوستانیوں کی بدقسمتی ہے کہ اس پریس کو نظر لگ گئی اور ہم سب کا ہی نہیں، در حقیقت علم ادب کا بھاری نقصان ہو گیا۔

مطبع نولکشور کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو معلوم ہو گا کہ یہ محض کتابیں چھاپنے کا ایک معمولی ادارہ نہیں تھا، بلکہ یہ ایک علمی مرکز تھا جہاں منشی نولکشور نے اپنے دور کے علماء فضلاء کی ایک بڑی تعداد کو جمع کر لیا تھا اور ان کی استعداد و صلاحیت کے مطابق انھیں مختلف کاموں پر مامور کر دیا تھا۔ اس طرح نولکشور صاحب کا یہ ادارہ مختلف نوعیت کے علمی کام انجام دینے

میں کامیاب ہوا۔ مطبع نولکشور کی بیسیوں مطبوعہ کتابوں پر مفید اور عالمانہ حواشی انہی علماء فضلاء کی علمی کاوشوں کا ثمرہ ہیں۔

منشی جی کے اعلیٰ اخلاق، علمی رویے اور بلند حوصلے نے ان کارکنان مطبع سے ایسے ایسے وقیع علمی کام کرائے جو آج بھی قابل تحسین اور ہمارے علمی و ادبی کاموں کی بنیاد ہیں۔

۱۸۸۴ء میں ایک امریکن نے نولکشور پریس کا معائنہ کیا تھا، اس کا بیان ہے کہ اس مطبع سے اسلامی کتابوں کے علاوہ ہندو اور بدھ مت کے ماننے والوں کی کتابیں بھی کثرت سے شائع اور کم قیمت پر فروخت کی جاتی ہیں۔ کتابوں کے لئے عرب، یورپ، ترکی اور افغانستان سے فرمائشیں آتی ہیں۔ مطبع خود ہی ٹائپ بھی تیار کرتا ہے۔ متعدد کمروں میں پریس کی مشینیں لگی ہوئی ہیں۔ امریکن نے ایک ایک کمرے میں اکسٹھ پریس شمار کئے تھے جو ہاتھ سے چلائے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ بجلی سے چلنے والی مشینیں بھی تھیں۔ تصنیف و تالیف کا بہت بڑا کام خود مطبع میں ہوتا ہے۔ اس امریکن کے بقول پریس کا گودام عجائب میں سے ہے۔ پریس میں بارہ سو سے کم لوگ کام نہیں کرتے۔

جن حضرات نے آج کے بڑے مطابع دیکھے ہیں وہ تصدیق کریں گے کہ ان میں بارہ سو لوگ مشکل ہی سے کام کرتے ہوں گے۔ مطبع نولکشور میں کام کرنے والوں کی یہ بڑی تعداد، اس پریس کی بے پناہ وسیع کارکردگی کا پتہ دیتی ہے۔

منشی نولکشور نے کتابوں کی طباعت کو محض ایک تجارت کے طور پر اختیار نہیں کیا تھا۔ جتنی بڑی تعداد اور ارزان قیمت پر اس مطبع سے کتابیں شائع ہوئی ہیں، انھیں دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ کتابیں چھاپنا، منشی نولکشور کے اس مشن کا حصہ تھا کہ ان کے ہم وطن جو بکثرت تعلیم سے بے بہرہ تھے، علم سے ہم کنار ہوں۔ منشی نولکشور اپنی اس مہم میں کامیاب نظر آتے ہیں، اس لیے کہ نہ صرف اس برصغیر کے چھوٹے بڑے کتابخانوں میں بلکہ دوسرے

ممالک کی لائبریریوں میں بھی ان کی مطبوعات دستیاب ہیں اور ضرورت مند ان اس فائدہ اٹھاتے ہیں۔

منشی نولکشور صاحب اگر نرے تاجر ہوتے تو وہ یہ طریقہ کار نہ اپناتے کہ اپنے قدیم ملازموں یا ان کی بیواؤں کو پانچ سو روپے پنشن دیتے۔ اپنے نادار ملازمین اوران کے خاندانوں کی مالی مدد کرنا ان کا معمول تھا۔ منشی نولکشور کے اسی خلوص نیت اور مشفقانہ رویئے نے ان کے ملازمین میں ان کے پریس کے لئے جان کھپا دینے پر آمادہ کیا اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اس مطبع سے منشی جی کی حیات ہی میں چار ہزار سے زیادہ مختلف کتابیں یعنی Titles شائع کیے گئے جو ایک عظیم کارنامہ ہے۔

منشی نولکشور نے سیاسی کاموں کے لیے بارہا اس زمانے میں بیس بیس ہزار روپے کی گرانقدر رقم فراہم کی۔ آپ مختلف علمی وادبی انجمنوں کو اپنی مطبوعات کی ایک ایک جلد بلا قیمت ارسال کیا کرتے تھے۔ آپ نے ایک پیپر مل بھی قائم کیا تھا۔ آپ کی عظمت محبوبیت اور آپ کے علمی وادبی کاموں کی افادیت کے پیش نظر آپ کو الہ آباد یونیورسٹی کا فیلو منتخب کیا گیا تھا۔ اس کے علاوہ آپ آنریری مجسٹریٹ، میونسپل کمیٹی کے ممبر اور جیل کے آنریری انسپکٹر رہے۔ آپ ۱۹ فروری ۱۸۹۵ء کو فوت ہوئے :

خدا رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

راقم اس وقت ایک ایسی کتاب کا تعارف کرانا چاہتا ہے، جو مطبع نولکشور سے شائع ہوئی اور ہندوستان میں فارسی زبان وادب کی تاریخ میں وہ ایک منفرد کتاب کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ کتاب ہے ''مطلع العلوم و مجمع الفنون''۔

ہندوستان میں مختلف سطحوں پر فارسی پڑھانے کے لئے درس میں مختلف کتابیں یا ان کے انتخابات شامل تھے۔ ۱۲۲۶ھ / ۱۸۴۶ء تک غالباً کوئی ایک کتاب ایسی مرتب نہیں کی

گئی تھی جسے فارسی کی درسی کتاب کا درجہ حاصل ہو۔ یہ کتاب مطبع نولکشور سے شائع ہوئی اور دہلی یونیورسٹی لائبریری میں اس کا نواں اڈیشن موجود ہے۔ یعنی یہ کتاب اپنی مقبولیت کی وجہ سے کم از کم نو بار مطبع نولکشور سے شائع کی گئی۔

منشی نولکشور کا ادارہ اس حقیقت سے واقف تھا کہ ہندوستان میں فارسی کی کوئی باقاعدہ درسی کتاب موجود نہیں، اس کمی کی تلافی ہونا چاہیے، اس لئے جیسے ہی ایک درسی کتاب انہیں بہم پہنچائی گئی، اسے شائع کر دیا۔ اور ضرورت مندوں نے اس سے بڑے پیمانے پر فائدہ اٹھایا۔

مطلع العلوم و مجمع الفنون کے مؤلف واجد علی خاں متخلص بہ واجدؔ ہیں۔ یہ ہگلی، کلکتہ میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد منشی عبدالواحد خان، نواب خان جہاں خان جسارت جنگ کے دربار سے ۲۵ برس تک وابستہ رہے۔ ان کے اجداد نے مغل دربار میں خدمات انجام دی تھیں۔ جسارت جنگ لاولد رہے، اس لیے ان کی وفات کے بعد ان سے وابستہ تمام افراد منتشر ہو گئے۔ منشی عبدالواحد خاں نے مسز اسمتھ سے جو عدالت میں ایک افسر تھیں، رجوع کیا اور ان کی ملازمت اختیار کر لی۔ منشی عبدالواحد خاں نے اس انگریز افسر کی مدح میں فارسی میں ایک مثنوی بھی نظم کی ہے۔

واجد کو ان کے والد نے تعلیم دی۔ فارسی کی مختلف کتابیں پڑھائیں واجد ۱۲ برس کی عمر تک اپنے والد سے تعلیم حاصل کرتے رہے۔ نستعلیق بھی سیکھی۔ ان کے والد پڑھانے میں سختی کرتے تھے، اور درسی کتابیں ان کے لیے دلچسپی کا باعث بھی نہیں تھیں، اس لیے ایک دن واجد نے پندرہ یا سولہ برس کی عمر میں کسی سے کہے سنے بغیر اپنا گھر چھوڑ دیا اور ہندوستان کے مختلف مقامات کی سیر و تفریح کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ اس سفر کے دوران انہوں نے مختلف اساتذہ سے استفادہ کیا۔ یہ ایک وسیع المشرب انسان تھے کچھ دن سرکاری مطبع میں

میر منشی کی حیثیت سے کام بھی کیا۔ قاضی محمد صادق اختر جو واجد کے ہم وطن تھے اور مطبع سلطانی، لکھنؤ میں خدمات انجام دینے لکھنؤ آئے تھے، واجد سے ملے تھے اختر نے ان کا ذکر اپنے کمیاب تذکرے ''آفتاب عالم تاب'' میں کیا ہے اور ان کا یہ شعر بھی نقل کیا ہے۔

یارم گزر نکردم بہ خاک مزارم

بر دامنش نہ بوسہ زند تا عتبارم

واجد اپنے دور کے نصاب تعلیم سے مطمئن نہ تھے ان کا خیال تھا اور درست تھا کہ اب فارسی زبان و ادب ہندوستان میں رو بہ زوال ہے صرف اس کی تعلیم سے اب زندگی گذرنے والی نہیں طالب علم کے لیے جہاں علوم سیکھنا ضروری ہے وہیں اسے مروجہ فنون سے بھی آشنائی حاصل کرنی چاہئے تاکہ تعلیم مکمل کرنے کے بعد وہ اگر کسی سرکاری ادارے میں جہاں صرف فارسی سے کام چل سکتا تھا اسے کام نہ مل سکے تو وہ صنعت و حرفت کے میدان میں مصروف کار ہو جائے۔ اس طرح وہ بیکاری کا شکار نہیں ہوگا۔ تعلیم کے میدان میں آج اسی رویے کو Vocatinolisation کہا جاتا ہے۔ آج سے ڈیڑھ سو برس پہلے اس کتاب کو منشی نو لکشور نے شائع کیا اور اس طرح اسی تعلیمی رویے کی حمایت کی جس پر آج زور دیا جا رہا ہے یہ ایک انقلابی قدم تھا۔

مطلع العلوم و مجمع الفنون جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ مطلع العلوم ہے، جس میں مختلف علوم بیان کیے گئے ہیں بعض اہم کتابوں کے اقتباسات بھی اس میں شامل ہیں ضرب الامثال، لطائف، نصائح، تاریخ، احوال شعراء جغرافیہ، موسیقی، منطق، فلسفہ، نجوم اور کیمیا ایسے عنوانات ہیں جن کے بارے میں مختصر مگر جامع اطلاعات اس حصے میں فراہم کی گئی ہیں تقریباً یہی عنوانات اس وقت درس میں بھی شامل تھے۔

کتاب کے دوسرے حصے، مجمع الفنون میں واجدؔ نے مختلف مروجہ فنون کی وضاحت کی ہے خواب کی تعبیر ،زیورات، سرجری، شکار، درس وتدریس ، کتابوں کی تدوین وترتیب، تالیف وتصنیف، گھوڑسواری، کھیتی باڑی، طباعت، کشتی، مصوری، سکے بنانا، کفش سازی اور کاغذسازی وغیرہ ایسے فنون ہیں جن کے بارے میں ایسی بنیادی اطلاعات فراہم کردی گئی ہیں کہ پڑھنے والا اگرانہیں بہتر طریقے سے سمجھ لے تو وہ ان تمام فنون سے روشناس ہو سکتا ہے اور پھر کسی ایک فن کو اپنے شغل کے طور پر اختیار کرسکتا ہے اور آبرومندانہ زندگی گزار سکتا ہے۔یہی مقصد تھا اس کتاب کے مرتب واجد علی خان واجدؔ کا۔

اس کتاب کے مطالب سے یہ واضح ہوتا ہے کہ منشی نولکشور کی سرکردگی میں ان کے مطبع کے صاحبان حل وعقد نہایت خلوص کے ساتھ سماج کی بہبودی کے لئے مصروف کار تھے۔

یہ تو محض ایک کتاب کاذکر ہے،ایسی متعدد کتابیں مطبع نولکشور سے شائع ہوئی ہیں،جو آج بھی سماجی زندگی کو سنوارنے کے لئے مفید ہیں۔

منشی نولکشور،ایک عظیم شخصیت

پروفیسر طلحہ رضوی برق

صدر،

شعبۂ اردو وفارسی

ویر کنور سنگھ یونیورسٹی آرہ۔ بہار

مت سہل انہیں جانو پھرتا ہے فلک برسوں

تب خاک کے پردے سے انسان نکلتے ہیں

ہندوستان کی علمی وادبی اور تہذیبی وثقافتی تاریخ میں منشی نولکشور ایک تاریخ ساز شخصیت کا نام ہے۔ یہ اردو کے عظیم شاعر مرزا غالب کے ہم عصر تھے۔ غالبؔ نے انہیں ''زھرہ صورت'' اور ''مشتری سیرت'' لکھا ہے۔ منشی نولکشور نے محض ۳۸ سال کی مدت میں ۲۲، ۲۳ علوم وفنون پر چار ہزار کتابیں اپنے مطبع سے شائع کیں۔ وہ ایک انسان دوست ، علم پرور اور ہر مذہب کا سچا احترام کرنے والے تھے۔ اسلامیات سے متعلق اردو فارسی اور عربی میں مختلف فنون اور شعروادب کی نایاب کتابیں شائع کر کے آپ نے وہ بے مثل کارنامہ انجام دیا جس نے آپ کو زندگی جاوید عطا کر دی۔

یہ باتیں ان سے متعلق لکھے گئے مضامین میں بار بار دہرائی گئی ہیں کہ ان کے پردادا اندر سنگھ، مرہٹہ فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ عسکری خدمات کے صلے میں انہیں حکومت کی طرف سے ایک جاگیر عطا ہوئی تھی۔

ان کے دادا، بال مکند جمنا پرشاد بھارگوا، موضع ساسنی ضلع علی گڈھ کے رئیس تھے۔ منشی نولکشور ضلع علی گڑھ کے اس دولت مند گھرانے میں متھراپور کے قریب ایک

گاؤں، ریڑھ میں بتاریخ ۳؍جنوری ۱۸۳۶ء اتوار کو پیدا ہوئے۔ (جناب امین سلونوی نے ۱۸۳۷ء لکھا ہے)

چھ سال کی عمر میں ان کے اصلی وطن ساسنی میں ان کی تعلیمی ابتدا ہوئی۔ اس زمانے کے رواج کے مطابق ان کی تعلیم مکتب میں ہوئی جہاں انہوں نے فارسی درسیات کی متداول کتابیں پڑھیں، عربی زبان بھی سیکھی، دس سال کی عمر میں ابتدائی تعلیم مکمل کرلی اور ثانوی تعلیم کے لئے گیارہ سال کی عمر میں آگرہ کالج میں داخل ہوئے۔ اسی دوران مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور آگرہ سے شائع ہونے والے ایک اخبار "سفیر" میں مضمون نگاری شروع کی۔ عام طور پر ان کے مضامین پسند کئے گئے۔ حکومت نے حوصلہ افزائی کی اور وظیفہ مقرر کردیا۔ رفتہ رفتہ ان کا رجحان صحافت کی طرف بڑھتا گیا۔ کالج سے تعلیم کا سلسلہ ترک کردیا اور مطالعہ کتب و مضمون نگاری کا مستقل شغل اختیار کرلیا۔ اردو زبان وادب میں خاصی مہارت حاصل کرلی۔ ہندی اور سنسکرت میں بھی اچھی خاصی استعداد بہم پہنچائی۔ انگریزی زبان بھی سیکھ لی اور سترہ سال کی عمر میں خاصی شہرت حاصل کرلی۔

اس کے بعد وہ لاہور جاتے ہیں۔ امیر حسن نورانی صاحب لکھتے ہیں :

"لاہور میں منشی نولکشور چار سال رہے ان کی عمر کا اکیسواں سال شروع ہو چکا تھا اور ۱۸۵۷ء میں تحریک جنگ آزادی کا آغاز بھی ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۸ء کے اوائل میں منشی نولکشور لکھنؤ پہنچے اور آغا میر کی ڈیوڑھی میں ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا، چند ہینڈ پریس خرید کر مطبع قائم کیا" (۱)

گویا اسطرح مطبع منشی نولکشور وجود میں آیا اور ان کی اقبال مندی کا ستارہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔

منشی نولکشور کے گود لئے بیٹے پراگ نرائن بھارگو تھے اور ان کے صاحبزادے راجہ

رام کمار بھار گوا جن کی پتنی محترمہ لیلا رام کمار بھار گوا ہیں۔ رانی صاحبہ اپنے مضمون بعنوان ''منشی نولکشور۔ حقائق کی روشنی میں'' رقم طراز ہیں۔

''منشی نولکشور کے والد جمنا پرشاد صاحب نے انہیں ایک مرتبہ فہمائش کی کہ تم آرام طلب ہوتے جارہے ہو اور کوئی کام نہیں کر سکتے ہو۔ منشی جی پر اس کا ایسا اثر ہوا کہ وہ گھر سے کسی قسم کی مالی امداد لئے بغیر لاہور چلے گئے اور معمولی مشاہرہ پر منشی ہر سکھ رائے کے اخبار ''کوہ نور'' کے عملۂ ادارت میں شامل ہوگئے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد ۱۸۵۸ء کے آخر میں لکھنو آئے اور مطبع منشی نولکشور کی بنیاد رکھی''۔

رانی صاحبہ اس معزز و محترم خانوادے کی ایک اہم اور باوقار فرد ہیں ان کی معلومات کا ذریعہ دیگر بزرگان خاندان اور خودان کے خاوند رہے ہوں گے جو منشی جی کے پوتے تھے۔

اس چھوٹی سی عبارت سے منشی نولکشور کے لاہور جانے سے متعلق اور لاہور سے لکھنؤ آنے کے بارے میں لکھے گئے متعدد بیانات کی تردید ہوتی ہے۔ فی الوقت مجھے ان تسامحات یا تضادات سے کوئی غرض نہیں۔ میری نظر میں اس عظیم الشان خانوادے کی یہ بات بے حد اہم معلوم ہوتی ہے کہ بابو جمنا پرشاد جو رئیس اور جاگیر دار تھے، عنفوان شباب میں داخل ایک لائق و ہونہار فرزند کو اس کی بظاہر آرام طلبی پر فہمائش کرتے ہیں۔ حالانکہ سوانح نولکشور میں اس متحرک و فعال شخصیت کو کہیں بھی آرام طلب نہیں دکھایا گیا ہے۔ ممکن ہے منشی جی کا انہماک مطالعہ اور شغل مضمون نویسی نے بابو جی کو یہ تاثر دیا ہو، تاہم کسی رئیس اور جاگیر دار باپ کی یا پھر دوراندیش و نیک بیں نگاہ منشی جی کی حساس و غیور طبیعت کے اسپ تازی کو ایک ہلکا سا تازیانہ دیتی ہے کہ جولانگاہ ہستی میں یہ تیزی و طراری کی حدیں پھلانگ جائے۔

اس مختصر مگر اہم اقتباس سے ذہن اس طرف بھی جاتا ہے کہ ہندوستانی زمین

داروں، رئیسوں اور جاگیرداروں سے متعلق عیش و عشرت، آرام طلبی اور ناز و نعم میں وقت گذاری کی کسی کیسی داستانیں گڑھی گئی ہیں۔

پنڈت سندر لال نے اپنی کتاب "۱۸۵۷ء" میں تاجدار اودھ نواب واجد علی شاہ اختر لکھنوی سے متعلق لکھا ہے کہ وہ دوپہر کی دھوپ میں گھوڑے پر سوار اپنی فوج کے جوانوں کو قواعد کراتے تھے۔ ایسی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے برٹش راج میں ہندوستانیوں کے خلاف کیسے کیسے افسانے اور کہانیاں بنا کر تاریخ سازی کی گئی ہے۔

نواب واجد علی شاہ نے لکھنؤ سے مٹیا برج کلکتہ جاتے ہوئے کہا تھا۔

در و دیوار پہ حسرت کی نظر کرتے ہیں
خوش رہو اہل وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

اس واقعہ دل سوز کے معاً بعد ہی منشی نول کشور نے لکھنؤ میں اپنی شب و روز کی جانفشانی سے علم و فضل کی وہ جوئے شیر رواں کر دی جو مطبع منشی نولکشور کے نام سے چار دانگ عالم میں مشہور ہے۔

۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء کو لکھنؤ کا یہ روشن چراغ تقریباً نصف صدی تک شبہائے صحافت و طباعت کو آداب چراغاں دے کر گل ہو گیا۔

---

(۱) (منشی نولکشور۔ حالات زندگی کا اجمالی خاکہ) ماہنامہ تعمیر ہریانہ جولائی اگست ۷۹ء

منشی نولکشور پاسدار محترم زبان و ادبیات فارسی

پروفیسر آزرمی دخت صفوی

علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نکل باغ قیصر سے مطبع میں آ — تماشا گلوں کا میں دیکھوں ذرا
حقیقت میں ہے قدرت کردگار — نہان خانۂ غیب سے آشکار
کہیں کیمیای سعادت چھپی — کہیں ہفت پیکر برابر لگی
چہ تصنیف فردوسی و انوری — تواریخ جمشید و اسکندری
تصانیف مجموع اہل زبان — جزو کل کلام زبان آوران
کتاب ایسی عالم میں ہے کون سی — جو مطبع میں یاں کے نہ ہووے چھپی
جناب نولکشور ذوالاکرام — کریم و سخی، باذل و نیک نام
جو معروف نزدیک اور دور ہے — غرض ہفت کشور میں مشہور ہے
علوم اسنے ارزان کیے اسقدر
جہاں میں رہے نہ کوئی بے ہنر

محسن علی خاں ساقی نے ان ابیات میں جس جوش اور ولولے کے ساتھ منشی نولکشور اور ان کے مطبع کو خراج عقیدت پیش کیا ہے اس جوش اور صمیمیت کے ساتھ فارسی ادب سے تعلق رکھنے والا ہر شخص اس روشن دماغ، علم دوست اور ادب پرور فارسی نواز کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ فارسی زبان و ادب پر نولکشور کا ایسا احسان ہے جو رہتی دنیا تک باقی رہیگا۔ یہ کہنے میں مجھے ذرا بھی تامل نہیں کہ اگر انکا وجود نہ ہوتا تو

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد ہندوستان میں فارسی زبان شاید محض ایک قصہ پارینہ اور ماضی کا دھندلا نقش بن کر رہ جاتی۔ یہ ان کی دور بینی، علم نوازی اور فارسی دوستی تھی جس نے ۱۸۵۷ء کے اس بحرانی دور میں بھی اس بات کا ادراک کر لیا کہ سیکڑوں سالوں پر پھیلی ہوئی فارسی شعر ادب کی یہ میراث اگر ہمارے ہاتھ سے نکل گئی تو ہم اپنے ماضی، تاریخ اور کلچر سے ہمیشہ کے لئے محروم ہو جائینگے۔ ایران اور ہندوستان میں جو فارسی ادب تخلیق ہوا، خواہ وہ سوانح ہو یا تذکرہ، کلیات شعر ہو یا نثر، تاریخ ہو یا لغت، کتب اخلاق ہوں یا رسالہ ھای تصوف و عرفان و ملفوظات، ہر ایک اپنی جگہ پر عقل و حکمت، تخیلات و افکار کا ایک خزانہ ہے، جو آئندہ آنے والوں کی رہنمائی کرے گا۔ اس دولت کو محفوظ رکھنے اور آنے والی نسلوں تک پہونچانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اسکو زیور طباعت سے آراستہ کر دیا جائے۔ انکے اس تاریخ ساز قدم نے ہندوستان میں فارسی کے ماضی کو سنہرے حروف میں لکھدیا اور اس کے مستقبل کی راہیں روشن کر دیں۔ اردو کے معروف نقاد اور ادیب عزیز احمد لکھتے ہیں:

"۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد اگر سر سید احمد خان اور منشی نو لکشور ہندوستان کے تمدن ورثہ اور ذہنی بیداری کی حفاظت نہ کرتے تو شاید ہندوستان آج ترقی کی دوڑ میں اس طرح آگے نہ بڑھ سکتا...... اگر نو لکشور ان بیش بہا خزانوں کا کھوج لگا کر طباعت کے ذریعہ انھیں زندہ جاوید نہ بناتے تو.... ان کی تباہی یقینی تھی۔ یہ ہمارے تمدن کا اتنا زبردست نقصان ہوتا جس کی تلافی ممکن نہ تھی۔ [۲]

ناظر کاکوروی "اردو کے ہندو ادیب" میں رقمطراز ہیں۔

"ہندوستانی مسلمان اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے اور نہ اس گران بہا احسان سے کبھی عہدہ بر آ ہو سکتے ہیں۔ منشی نو لکشور کی جو درخشاں خدمات مسلم ہیں وہ بحیثیت مجموعی کوئی مسلمان انفرادی یا اجتماعی طور پر سرانجام نہ دے سکا"۔ [۳]

مخصوصاً ان کی فارسی زبان و ادب کی خدمات کے بارے میں پروفیسر امیر حسن عابدی صاحب نے جو فرمایا ہے وہ خود ایک دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ کہتے ہیں :

"یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ فارسی عربی اور اردو میں جتنی کتابیں نولکشور پریس سے شائع ہوئی ہیں اتنی غالباً کسی ملک میں شایع نہ ہوئی ہونگی......اس پریس سے اس وقت فارسی کتابیں شایع ہو رہی تھیں جب کہ خود فارسی بولنے والے ملکوں میں شاید پریس کا رواج بھی نہ تھا....."

ہندوستان اور فارسی کا تعلق صدھا برس پرانا ہے۔ (گیارھویں صدی م) لاہور میں غزنوی حکومت کے بعد یہ رابطہ اور مستحکم اور واضح ہوا اور عہد تیموری میں تو فارسی زبان و ادب کی ترویج اور تخلیق میں ہندوستان ایران سے بھی آگے بڑھ گیا تھا۔ دلی دکن اور لاہور، خراسان، فارس اور اصفہان سے بازی لے گئے تھے۔ شاھان صفویہ کی ادب کی طرف سے فی الجملہ بے توجہی اور مذہبی رجحان نے ایران کے ادباء اور شعراء کو مایوس کیا تو وہ ہندوستان کی طرف متوجہ ہوئے۔ یہاں اس وقت مغل سلطنت کا نیر تاباں اپنی پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ نئے ملک میں نئی حکومت قایم ہونے کا ولولہ اور جوش شاھان مغلیہ کو ہر میدان میں اپنا پرچم لہرانے کا حوصلہ دلوا رہا تھا۔ مغل سلاطین اور امراء کی علم پروری اور ادب دوستی کا شہرہ سنکر ایران کے شعراء اور ادباء نے جوق درجوق ہندوستان کا رخ کیا۔ یہ تعداد اتنی بے شمار ہے کہ احمد گلچیں معانی کی ضخیم کتاب "کاروان ہند" کے صفحات میں بھی نہ سما سکی۔ ہندوستان میں ان شعراء اور ادباء کی پذیرائی اور قدر دانی، ان کی توقع سے بھی کہیں زیادہ ہوئی۔ بقول شاعر:-

در ایران تلخ گشتہ کام جانم
بباید شد سوی ہندوستانم

چو قطرہ جانب عمان فرستم
متاع خود بہندوستان فرستم
کہ نبود در سخن دانان دوران
خریدار سخن جز خانخانان

مغل سلطنت کے زوال کے بعد فارسی زبان کا ہندوستان میں انحطاط تو ضرور شروع ہوا لیکن تقریباً ایک ہزار سال تک وہ یہاں اپنا سکہ جما چکی تھی۔ فارسی ملک کی سرکاری زبان رہی تھی۔ مکاتب اور مدارس میں اس کی تدریس صدیوں سے ہو رہی تھی۔ ہزاروں شعرا کے دواوین نثر نگاروں کے ادبی فن پارے، کتب تاریخ و تذکرہ و لغت، سرکاری دستاویزیں فارسی میں لکھے ہوئے سلاطین، امراء اور گورنروں کے خطوط ہزاروں کی تعداد میں سرکاری اور ذاتی کتب خانوں میں موجود تھے۔ دہلی کے زوال کے بعد اودھ ایک نئے مرکز ادب و فرہنگ کی حیثیت سے ابھرا تھا اور سلاطین اودھ کو بھی علم وادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ فارسی کے نادر مخطوطے اور اہم کتابیں ان کے کتب خانوں کی زینت تھیں۔ سعادت علی خاں، غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر، واجد علی شاہ وغیرہ کے کتاب خانے بیش بہا فارسی تصنیفات و تالیفات کا خزانہ تھیں۔ ۱۸۵۷ء کے دلدوز واقعات کے ساتھ اودھ سلطنت بھی اختتام پذیر ہوئی۔ مطبع سلطانی ختم ہوا۔ اودھ بادشاہوں کے بے پناہ شوق سے جمع کئے ہوئے فارسی مخطوطات اور کتابیں یا تو لوٹ لی گئیں یا سرکار انگریزی نے انکولندن بھجوا دیا جہاں وہ آج بھی برٹش میوزیم اور انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہیں۔ اس بربادی اور لوٹ کے باوجود بے شمار مخطوطات اور کتابیں خود اودھ کے نجی کتاب خانوں، ملک کے دوسرے علمی مراکز، خانقاہوں، مدارس اور علم دوست حضرات کے پاس محفوظ تھے۔ منشی نولکشور کے مطبع کے قیام کے بعد ہی یہ فکر لاحق ہوئی کہ وہ ان نادر اور کم یاب فارسی مخطوطوں اور

مسودات کو شایع کر دیں تا کہ کم سے کم وہ ضایع نہ ہوں اور صاحبان علم ان سے مستفید ہو سکیں ۔ نولکشور کے زمانے میں فارسی کی سرکاری حیثیت تو باقی نہ رہی تھی لیکن اس وقت بھی اس کو علمی زبان کا مرتبہ حاصل تھا۔ مذہبی اور درسی کتابیں اکثر فارسی میں تھیں اور ہندو مسلمان دونوں فارسی کے دلدادہ تھے۔ ابتدا میں مطبع نولکشور میں سرکاری کاغذات اور درس کی مختصر کتابیں چھاپی گئیں۔ مطبع کے آغاز اور ترقی کے بارے میں خود انھوں نے ۸ جنوری ۱۸۶۲ء کے اودھ اخبار میں نہایت فصیح اردو میں ایک مضمون لکھا جو جگہ جگہ خوبصورت فارسی اشعار سے مزین ہے۔ ان اشعار کو انھوں نے جس برجستگی اور بے ساختگی سے صرف کیا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فارسی شعر وادب پر نہ صرف ان کی گہری اور وسیع نگاہ تھی بلکہ وہ ان کے روز مرہ میں داخل تھی۔ ان کی اردو نثر میں فارسی انشاء پردازی کا انداز موجود ہے :

"یہ ذرہ بے مقدار، ہیچ، نولکشور جملہ اکابر وروساو عنایت۔ فرمان نزدیک ودور کا شکریہ ادا کرتا ہے پر تو توجہ جناب خداوند نعمت، مرکز دائرہ حشمت ورفعت کرنل ایبٹ صاحب بہادر کا ہے جنکے عواطف جمیل کا سپاس اگر ہر موی بدن ایک زبان پیدا کرے، عمر بھر ممکن نہیں۔ اس شعر کا مضمون راست آتا ہے :

شکر فیض تو چمن چوں کند ای بہار   کہ اگر خار واگر گل ہمہ پروردہ تست

ہر چند اس مطبع کی بلند نامی اور اقتدار عالی کا کوئی دشمن خواب میں بھی دکھائی نہیں دیتا پھر بھی،

دیدۂ بد خواب کہ بر کندہ باد   عیب نماید ہنرش در نظر

گرنہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ
راست خواهی ہزار چشم چنان   کور بہتر، نہ آفتاب سیاہ

مطبع کی ترقی کے ساتھ فارسی کتابوں کی طباعت کا کام پوری سرگرمی سے شروع ہوا۔ سب سے پہلا قدم تھا فارسی مخطوطوں اور مسودات کی فراہمی کا۔ انھوں نے بڑی لگن، تگ ودو اور صمیمیت سے اس کام کو شروع کیا۔ وہ ملک کے علمی اور ادبی حلقوں میں جانے اور مانے جاتے تھے اور لوگ انکو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لاکر جگہ جگہ سے فارسی مخطوطات، مسودات اور کتابوں کی جمع آوری شروع کی۔ بہت سے اہم نسخے شاہان اودھ کی اولاد کے پاس، اور ان کے امرا و رؤسا کے پسماندگان کے ہاں موجود تھے۔ نولکشور نے ان مسودات اور قلمی نسخوں کو خطیر رقم دے دیکر خریدنا شروع کیا۔ جب رفتہ رفتہ اطراف کشور میں ان کے مطبع کی شہرت پھیلی تو ان لوگوں نے جو فارسی کا ذاتی ذخیرہ رکھتے تھے ان سے رابطہ قایم کرنا شروع کیا اور انھوں نے منھ مانگی قیمت دیکر ان سے کتابیں اور مسودات خریدے۔ اگر ان کو کسی دوسرے شہر میں کسی اہم نسخے کی اطلاع ملتی تھی تو وہ اپنا آدمی بھیج کر اس کو حاصل کروالیتے تھے۔ انھوں نے شہر کے کباڑیوں تک کے پاس جاکر بعض نہایت نادر اور نایاب نسخے خریدے۔ ان کا ذوق شوق اور فارسی سے انکا والہانہ لگاؤ دیکھ کر بہت سے علم دوست حضرات نے بے معاوضہ اپنے مخطوطات ان کو دیدیے امیر حسن نورانی صاحب کے مطابق جیون چرتر کا مؤلف لکھتا ہے :

"پرانی کتابیں ڈھونڈنے سے نہیں ملتی تھیں۔ آپ نے ان کی کھوج کرنا شروع کیا اور بڑے بڑے امرا، متوسلان خاندان شاہی کے کتاب خانوں اور جہاں سے مل سکیں ہزاروں روپیہ خرچ کر کے بہم پہونچائیں......... تن من دھن لگا کر اپنے مطبع میں چھپوائیں........"

مطبع نولکشور کی شہرت ملک سے باہر بھی پھیلنا شروع ہوئی۔ ایران میں وہ دور شاہان قاچار کا دور تھا اور وہاں شاہی جبر و استبداد کے خلاف عوام میں بیداری پھیلنا

شروع ہو چکی تھی۔ ان دنوں ایران میں بھی چھاپ خانے نئے نئے قایم ہو رہے تھے۔ لیکن وقت کے تقاضے کے تحت ان میں اکثر عصری ادب شایع ہو رہا تھا۔ یورپین کتابوں کے ترجمے، سفر نامے، روزنامے، مجلّے وغیرہ۔ ہندوستان میں نولکشور کا مطبع کلاسکی ایرانی ادب کی کتابیں کثرت سے شایع کر رہا تھا اور خود ایرانی تاجران سے کتابیں خرید اکرتے یا فرمایش کر کے طبع کرواتے۔

فارسی مخطوطوں کی تصحیح اور کتابت کی طرف ان کی خاص توجہ تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے فارسی دان علما اور اہل قلم حضرات کی مدد حاصل کی۔ لکھنؤ کی معاشی بدحالی کے سبب وہاں کے بہت سے اصحاب علم و ادب پریشان حالی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ان میں مختلف علوم و فنون کے ماہر اور بڑے بڑے اسکالر اور عالم بھی شامل تھے۔ منشی نولکشور نے پورے عزت اور احترام کے ساتھ اور مقبول مشاہرہ پر انکو مطبع میں کام کرنے پر آمادہ کیا۔ آہستہ آہستہ لکھنؤ اور گردنواح کے صاحبان ہنر مطبع سے وابستہ ہوتے گئے۔ سچ تو یہ ہے کہ نولکشور پریس نے ایک طرح کے ریسرچ انسٹی ٹیوٹ اور اکیڈمی کی شکل اختیار کر لی اور ملک کے نامور مصنفین، مترجمین اور علما کا مرکز بن گیا۔ ناظر کاکوروی لکھتے ہیں:

”لکھنؤ میں جس قدر مشہور حافظ، مورخ، ادیب و شاعر، اس مطبع میں بیک وقت جمع ہو گئے تھے ہندوستان کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہیں ہوئے.........“ [۶]

جیون چرتر کے مؤلف نے لکھا ہے:

”پنڈت، سنسکرت بید پران جاننے والے، عالم عربی اور فارسی کے بڑھائے“

طباعت سے قبل مسودہ کسی ایک فارسی دان عالم کے سپرد کر دیا جاتا جو اول سے آخر تک پوری توجہ سے اسکو پڑھتا، جہاں کوئی سقم ہوتا اسکو دور کرتا، الفاظ و عبارت کی صحت کا خاص خیال رکھا جاتا اور پھر وہ طباعت کو دیدیا جاتا۔ منشی نولکشور نے ایسے ایسے ایرانی اساتذہ کے

دواوین اور کلیات شایع کروائے جو اس وقت تک خود ایران میں بھی منظر عام پر نہ آئے تھے۔ اسی کے ساتھ ساتھ خود ہندوستان کے فارسی گو شعرا کے کلام اور نثری کتابوں سے اہل ایران کو روشناس کروایا۔ لغت، تاریخ، تذکرہ، دستورِ زبان، عروض و قافیہ پر ہندوستان میں ایران سے زیادہ کتابیں لکھی گئی تھیں اور ان میں سے زیادہ تر کو مطبع نولکشور نے ہی طبع کیا تھا۔ ان سب کا ذکر کرنا تقریباً نا ممکن ہے۔ ذیل میں مشتے نمونہ از خردار کے طور پر نولکشور پریس کی چند اھم فارسی مطبوعات کے نام دیے جاتے ہیں۔

۱۔ شاھنامہ فردوسی ۳ جلد
۲۔ شرح مثنوی مولانا روم
۳۔ مثنوی مولانا روم
۴۔ حدیقہ سنایی
۵۔ دیوان حافظ
۶۔ دیوان شمس تبریز
۷۔ خمسۂ نظامی
۸۔ کلیات سعدی

کلیات و دواین

۹۔ کلیات انوری
۱۰۔ کلیات ظہیر فاریابی
۱۱۔ کلیات خاقانی
۱۲۔ دیوان عرفی
۱۳۔ دیوان نظیری
۱۴۔ دیوان ظہوری
۱۵۔ دیوان کلیم
۱۶۔ کلیات صائب
۱۷۔ دیوان امیر خسرو
۱۸۔ دیوان حسن سنجری
۱۹۔ کلیات صائب
۲۰ دیوان بیدل

ان میں سے اکثر کلیات اور دواوین وہ ہیں جو پہلی بار مطبع نولکشور سے شایع ہوئے۔

فارسی نثر

۱۔ گلستان سعدی ۔ جسکی کتابت مشہور کاتب شمس الدین اعجاز رقم نے کی تھی یہ گلستان

متعدد مرتبہ شایع ہوئی۔

۲۔ شرح گلستان

۳۔ شرح بوستان از ٹیک چند بہار

۴۔ بہارستان جامی

۵۔ اخلاق جلالی

۶۔ اخلاق محسنی

۷۔ انوار سہیلی

۸۔ اعجاز خسروی

۹۔ مکاتیب ابوالفضل

۱۰۔ وقایع نعمت خان عالی

۱۱۔ رقعات عالمگیر

۱۲۔ سہ نثر ظہوری

گلستان اور بوستان کے ۲۰ سے زیادہ نسخے نولکشور پریس نے طبع کئے۔

تصوف واخلاق

۱۔ کشف المحجوب

۲۔ نفحاۃ الانس

۳۔ تذکرۃ الاولیاء

۴۔ کیمیائے سعادت

منشی نولکشور کو لغت اور تاریخ کی اہمیت کا پورے طور پر احساس تھا چنانچہ انھوں نے فارسی کی تقریباً سب مفید و مستند لغات اور کتب تاریخ کو شایع کیا ہے۔ فقط چند کے نام دیے جارہے ہیں :

۱۔ **برھان قاطع**۔ فارسی زبان کا یہ بہت مشہور لغت ہے۔ اس میں انیس ہزار ایک سو ستتر الفاظ پہلوی، دری، یونانی، زندوپازند اور عربی کے شامل ہیں، جو فارسی میں مستعمل ہیں۔ یہ لغت ۱۰۶۲ھ مرتب کیا گیا تھا۔ نولکشور نے اسکا معتبر نسخہ حاصل کر کے ماہرین زبان و لغت سے اس کی تصحیح کروائی۔ یہ دو جلدوں میں شایع کیا گیا اور ایران میں بہت مقبول ہوا۔

۲۔ جامع اللغات

۳۔ فرہنگ آنند راج۔

یہ ۳جلدوں میں شایع ہوااور اس میں اصطلاحات عروض قواعد، مرادفات وغیرہ موجود ہیں جو حوالے کے اشعار کیساتھ درج کئے گئے ہیں۔ اس کے ۳۱۶۱ سفحات ہیں۔آج بھی اہل علم اس سے استفادہ حاصل کرتے ہیں۔

۴۔ فرہنگ جہانگیری
۵۔ غیاث اللغات
۶۔ مصطلحات الشعرا :
۷۔ بہار عجم
۸۔ ہفت قلزم
۹۔ کشف اللغات
۱۰۔ لغات کشوری

کتب تاریخ

منشی نولکشور جانتے تھے کہ کسی بھی ملک اور قوم کے لئے تاریخ نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ ہندوستانی تاریخ کے زیادہ تر ماخذ فارسی زبان میں تھے۔ انھوں نے بڑی کاوش اور جانفشانی کے ساتھ ان کے مخطوطات اور مسودات کو فراہم کیااوران کو بڑے ہی اہتمام کے ساتھ چھپوایا۔ بعض کتابوں کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے فارسی متن کے علاوہ انکا اردو ترجمہ بھی شائع کروایا۔ ان کے ناموں سے آپ کوان کی اہمیت کا اندازہ ہو جائیگا۔ فقط چند کے نام لکھنے پر اکتفاکی جارہی ہے :

۱۔ آئین اکبری۔ مع تصاویر و نقشہ ھا، سہ جلد
۲۔ تاریخ فرشتہ
۳۔ تاریخ طبری (ترجمہ فارسی بلعمی)
۴۔ طبقات اکبری

۵۔ روضۃ الصفا

۶۔ منتخب التواریخ

۷۔ تتزک جہانگیری

۸۔ اکبر نامہ

۹۔ سیر المتاخرین

۱۰۔ عماد السعادت

اس کے علاوہ طب، تفسیر، فقہ پر بے شمار کتابوں کا عربی اور فارسی سے اردو میں ترجمہ کروایا۔ فیضی کی بے نقط تفسیر قرآن "سواطع الالہام" شایع کی۔

مطبع نولکشور میں فارسی اور عربی کتابوں کی تصحیح و ترجمہ کرنے والوں میں ملک کے بڑے بڑے عالموں کے نام شامل ہیں، مولانا سید امیر علی ملیح آبادی، مولانا احسن نانوتوی، مولانا فخر الدین فرنگی محلی، مولانا احتشام الدین مراد آبادی (انھوں نے منتخب التواریخ کا اردو میں ترجمہ کیا)، مفتی غلام سرور لاہوری، مولانا محمد اسمٰعیل، قدر بلگرامی، مولوی صادق علی لکھنوی (مترجم دیوان حافظ) گوکل پرشاد (مترجم سیر المتاخرین) پنڈت کالی چرن (مترجم جلد اول شاہنامہ بزبان ہندی) وغیرہ۔ ان کے علاوہ ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر علماء ان کے مصنفین میں شامل تھے۔

یہاں ایک بات کی طرف خصوصی توجہ دلوانا چاہتی ہوں۔ نولکشور کی مطبوعہ اکثر فارسی کتابوں، خصوصاً کلیات اور دوادین کے ساتھ شرح بھی ہوتی تھی۔ یعنی کتاب کے حاشیوں پر مشکل اور نامانوس الفاظ اور تراکیب کے معنی لکھدیے جاتے تھے۔ بعض اوقات خلاصہ اور پوری بیت کی تشریح بھی کردی جاتی تھی۔ اس تشریح کو پڑھیے تو اندازہ ہوتا ہے، کہ اس متن پر کام کرنے والا فارسی زبان و ادب اور مختلف علوم و فنون پر کیسی گہری نظر رکھتا

تھا۔ واضح رہے کہ یہ تشریح محض مشکل الفاظ ہی کی نہیں ہوتی تھی۔ منشی نولکشور نے جس دور کی کتابیں چھاپی ہیں اس دور کی فارسی کا ایک خاص مزاج تھا۔ سبک خراسانی ہو، سبک عراقی، سبک آذربائیجانی یا سبک ہندی عموماً کی زبان اور Diction عالمانہ ہوتا تھا اور اکثر اس میں منطق، فلسفہ، نجوم، ہئیت، ہندسہ، شطرنج، چوگان، طب، موسیقی اور جفر وغیرہ کی اصطلاحات صرف کی جاتی تھیں۔ تلمیحات، عربی الفاظ و تراکیب، آیات قرانی وغیرہ کا استعمال بھی بہت عام تھا۔ چند اشعار بطور مثال :

انوری : ؎

برجای عطارد بنشاند قلم تو — گردر سر منقار کشد جذر اصم را

خاقانی :؎

زهره بدو زخم از سر نعش — در رقص کشد سه خواهران را

می لعل ده چو ناخنه دیدۂ شفق — تا رنگ صبح ناخن مارا برافگند

سر راست تخن سنبله از بخر من آر — تا ہستی بعقرب سرما بر افگند

اسفند یار این دژ روئین منم بشرط — ہر ہفتم ہفت خوانش بہ تنہا بر آورم

ظاہر ہے کہ ان کے اشعار کی شرح کیلئے شارح کا ان تمام علوم و اصطلاحات پر حاوی ہونا ضروری تھا۔ مطبع نولکشور سے مطبوعہ ان شعرا کے دواوین اور کلیات پر نظر ڈالئے تو معلوم ہوگا کہ تقریباً ہر ایک متن کے ساتھ حاشیہ پر شرح موجود ہے اور شارح بیشتر اوقات ان تمام تلمیحات و اصطلاحات وغیرہ کی معنی یابی اور تشریح سے بخوبی عہد بر آ ہوا ہے۔ یہ شرحیں پڑھنے والے کے لئے خاص مدد بھی ثابت ہوتی ہیں۔ میں خود جب طالب علم تھی اور خاقانی کے قصائد کے گورکھ دھندوں میں الجھتی تھی تو نولکشور کے شارح کے لئے دل سے دعا

ضرور نکلتی تھی !

ایک اور اہم بات بھی ہے بعض اوقات نولکشور کے مصححین کی تصحیح اور ان کے تیار کردہ متن زمانۂ موجودہ کے متون انتقادی سے بہتر ہوتے ہیں۔ وہ زمانہ Comparision اور Collation کا نہ تھا، نہ اس وقت تک ہم مغربی اصول تدوین سے آشنا ہوئے تھے اور نہ اتنے نسخے ہی دستاب ہوتے تھے کہ تصحیح کرتے وقت انکو سامنے رکھ کر ایک متن درست کیا جاسکے۔ چنانچہ عموماً جو متن فراہم ہو جاتے تھے انھیں سے نسخۂ مطبوعہ تیار کیا جاتا تھا۔ اگر متن کے کسی لفظ یا ترکیب میں کچھ شبہ ہوتا تھا تو مصحح یا کاتب اپنی معلومات، ذوق اور سمجھ کو کام میں لا کر اس کو درست کر دیتا تھا۔ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ تصحیح قیاسی اب پوری طرح مردود و مفقود ہے لیکن کیا کیا جائے کہ بعض چاپ ھای نولکشوری کا متن ایران کے جدید "چاپہای انتقادی مع حواشی و تعلیقات" سے زیادہ درست بھی نظر آتا ہے اور لطیف بھی۔ اس سے یہ اندازہ کرنا غلط نہ ہوگا کہ نولکشور کے اکثر مصحح اور شارح باسواد بھی تھے اور باذوق بھی اور وہ انکو بڑے تفحص اور چھان بین کے بعد فارسی متون کا کام سونپتے تھے۔ اس کی مثالیں تو بے شمار ہیں لیکن میں یہاں صرف دو پر اکتفا کرونگی :

۱۔ عرفی کا مشہور قصیدہ ؎

چاپ ایران ۔ اقبال کرم می گزد ارباب ھمم را
همت نخورد نیشترلا و نعم را

اعتراض : ارباب کرم کی زبان "لا" سے نا آشنا ہوتی ہے، پھر اسپر "لا" کیونکر آئیگا؟

چاپ نولکشور :

همت نخورد نشتر آری و نعم را

نولکشور کا مصحح اس نکتہ کی طرف بخوبی متوجہ تھا عرفی جیسے صاحب کمال نے یہ

غلطی نہ کی ہو گی، چنانچہ اس نے اصل متن میں "آری" استعمال کیا، البتہ حاشیہ پر بطور نسخہ بدل "لاو نعم" لکھدیا۔ اس کی اساس کوئی دوسرا نسخہ تھا، یا اس کا ادبی ذوق، معلوم نہیں، بہر حال معنیٰ کا سقم ضرور دور ہو گیا۔

۲۔ عرفی کا ایک اور مشہور قصیدہ : کلیات عرفی شیرازی، بکوشش غلام حسین جواھری، اس کا متن بقول خود ان کے، انھوں نے "دہ نسخہ ھای چاپی و خطی" سے مقابلہ کے بعد تیار کیا ہے :

زبان ز نکتہ فروماند و راز من باقیست

بضاعت سخن آخر شد سخن باقیست

میرے فہم ناقص میں "فروماند" سے قبل ایسا کلمہ ہونا چاہئے جس میں فعلی معنیٰ ہوں، جیسے 'نطق' (بمعنی تکلم) نہ کہ اسمی معنیٰ جیسے نکتہ، اگر اسمی معنیٰ ہونگے تو مفہوم عبارت یہ ہو گا کہ اس چیز تک رسائی نہ ہوئی۔ زبان ز نکتہ فروماند یعنی زبان اس نکتہ تک نہ پہونچ سکی۔ زبان نکتہ تک پہونچ بھی کیا سکتی ہے نکتہ یابی ذھن و فکر کا کام ہے اگر فعلی معنی ہونگے تو مفہوم عبارت یہ ہو گا کہ کام کا سر انجام نہ ہو سکا۔ زبان نطق فروماند' یعنی زبان 'حرف زدن' اور بیان سے قاصر رہی۔ اور یہی مراد شاعر ہے۔ نولکشور کے "حنائی کاغذ" والے کلیات عرفی میں بیت کی قرأت یوں ہی ہے :

کلیات عرفی، چاپ نولکشور :

زبان ز نطق فروماند و راز من باقیست

بضاعت سخن آخر شد و سخن باقیست

اس ناشر کو اپنے نسخہ اصل کے لئے کوئی دعویٰ نہیں، نہ وہ قدیمی تھا نہ منحصر، لیکن اس میں نقل شدہ، عرفی کی یہ بیت نسخہ ایران سے قدیلہ بپا معنی تر اور بامزہ تر ہے۔

۳۔ ایک مثال بوستان سعدی سے، ابلیس والی معروف ابیات کی۔

دیوان شیخ اجل سعدی شیرازی از روی نسخہ تصحیح شدہ مرحوم فروغی و عباس اقبال با مقدمہ از مظاہر تہران۔

ندانم کجا دیدہ ام در کتاب — کہ ابلیس رادید شخصی بخواب
ببالا صنوبر بدیدن چو حور — چو خورشید از چہرہ می تافت نور
فرارفت وگفت ای عجب این توئی — فرشتہ نباشد بدیں نیکوئی
تو کاین روی داری بحسن قمر — چرا در جہانی بزشتی سمر
چرا نقشبندت در ایوان شاہ — دژم روی کہ دست وزشت وتباہ
شنید ایں سخن بخت برگشتہ دیو — بزاری برآورد بانگ و عزیو
کہ ای نیک بخت ایں نہ شکل منست — ولیکن تعلم درکف دشمن است

کلیات سعدی چاپ نو لکشور، کانپور ۱۸۹۵ء اس نسخہ چاپی میں یہ قصہ سات کی جگہ فقط پانچ ابیات میں ہوا ہے لیکن اس اختصار کے باوجود یہ ابیات اس واقعہ کو جس طرح واضح اور مجسم کرتی ہیں وہ بات ایرانی نسخے کی ابیات میں کہاں ملاحظہ فرمائیے :

مرا ابلس زادید شخصی بخواب — بقامت صنوبر بروی آفتاب
نظر کرو گفت ای نظر قمر — ندارند خلف از حیات خبر
ترا سہمگین روی پنداشتند — بگر مایہ در زشت بنگا شتند
بخندید وگفت ان نہ شکل منست — ولیکن قلم درکف دشمنست
براند اختم بیخ شان از بہشت — کنونم بہ کیں بی نگارند زشت

"بانگ غریو" شیطان کے کردار کی وہ تصویر کشی نہیں کرتا جو ایک لفظ "بخندید" کرتا ہے، اس سے شیطان کی شیطنت مجسم ہو کر سامنے آجاتی ہے گریہ وزاری کا شیطان سے تعلق ظاہر کرنا، اس کے کردار سے فی الجملہ منافی ہے۔ "ای نیک بخت" کا لفظ بھی خلاف بلاغت ہے۔ شیطان

ایسا فرشتہ صفت کیونکر ہو گیا کہ اپنے دشمن ازلی حضرت انسان کو نیک بخت "کہہ کر خطاب کرے۔

اس کے مقابل نسخہ نولکشور میں "نہ زاری" ہے۔نہ بانگ وغریونہ "نہ نیک بخت" ایک جگہ "بخندید" ہے اور دوسری جگہ "براانداختم بیخ شاں از پشت" یہ دونوں مفہوم باہم بکلی متناسب اور ساز گار ہیں اور شیطان کو اس کی پوری شیطنت کے ساتھ نظر کے سامنے لاتے ہیں۔ان حکایتوں کا یہ مقایسہ معنوی تھا،اب دو باتیں ان کے جنبۂ لفظی سے متعلق بھی:

ایرانی حکایت بیت اول میں "دیدہ ام" اور "دید" کا اجتماع ہے۔یہ ایک بات اس امر کے ثبوت کو کافی ہے کہ یہ حکایت یا کم سے کم اس کی یہ بیت کسی استاد کے قلم کی نہیں، کسی مبتدی کے قلم کی ہے۔بلکہ شاید مبتدی بھی لکھتا تو تکرار لفظی سے بچنے کے لئے "دیدہ ام" کی جگہ "خواندہ ام" لکھ دیتا۔بہر حال ایرانی نسخے کی اس بیت کی قرآت سعدی جیسے افصح المتکلمین کے سبک سے میل نہیں کھاتی۔

نولکشور کی بیت اول میں "دید" کا لفظ آچکا ہے "مر ابلیس را دید شخصی بخواب"،اس کے بعد بیت دوم میں "نظر کرد" (نظر کرد وگفت ای نظیر قمر) بلاشبہ حشو ہے۔لیکن شاعر نے اس مصرع میں نظر کے بعد "نظیر" لکھدیا ہے۔اس سے اس حشو کی قباحت بھی ملاحت بن گئی۔یہ ریزہ کاری شاعران ماھر کے سوا کسی اور کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہاں یہ ضرور سوچنا ہو گا کہ سعدی کی لکھی ہوئی حکایت کون سی ہے؟ ایرانی نسخہ قدیم منحصر" کی یا اس نولکشوری نسخہ حادث بازاری کی؟اگر اس نسخۂ قدیم کی حکایت سعدی کی تحریر کے مطابق ہے تو نسخۂ نولکشور کا کاتب بلاغت اور پرکاری میں شیخ اجل سے جلیل تر قرار پاتا ہے!اور ظاھر ہے یہ قرین قیاس نہیں۔ہاں یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ منشی نول کشور کی تلاش و تفحص کے نتیجہ میں انکو اصل سے نزدیک تر نسخے بھی ملے ہیں۔

نولکشور کو فارسی ادب سے ایسا غیر معمولی لگاؤ تھا اور وہ فارسی اساتذہ اور اہل قلم اساتذہ قلم کے ایسے قدر دان تھے کہ انھوں نے غالبؔ کی قاطع برھان، کلیات نظم فارسی، کلیات نثر اور دعائے صباح خود مرزا کی زندگی میں ہی شایع کروادیں۔

فارسی دوست حضرات اس توجہ کے لئے ان کے جس قدر احسان مند ہوں کم ہے۔ اگر وہ اس وقت اس طرف توجہ نہ کرتے اور غالب کو ان کی طباعت کے لئے آمادہ نہ کرتے تو اس نابغۂ روزگار شاعر کا فارسی کلام خدا جانے منظر عام پر آتا۔

نولکشور کے غالبؔ سے مراسم تھے، وہ ان کو فارسی میں خط لکھتے تھے اور خود مرزاؔ سے بھی فرمائش کی تھی کہ وہ جواب فارسی میں دیں۔ اگر چہ غالب اس وقت فارسی میں خط و کتابت چھوڑ چکے تھے لیکن ان کی خواہش پوری کی، جیسا کہ ان کے خط سے ظاہر ہوتا ہے۔

امروز سخن می گویم باکسی کہ دیدہ رویش رانادیدہ است، ولی دل بمہرش گرویدہ .....در پارسی زبان بسا سخن گفتہ ام، اکنون کہ دل از ناتوانی بہ نگارش بر نمی تابد کار خود آسان کردہ ام درار دومی نویسم .... محرمان شما پذیر فتم و درنامہ پارسی آمیختہ بتازی سخن گفتم۔"

منشی نولکشور سے غالب کی پہلی ملاقات دھلی میں ہوئی وہ ان سے حد درجہ متاثر ہوئے اور اس کا اظہار اپنے ایک خط میں یوں کرتے ہیں :

"شفیق مکرم اور لطف مجسم منشی نولکشور صاحب یہاں آئے، خالق نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے۔ گویا بجائے خود قران السعدین ہیں"۔

یہ خط علاءالدین احمد خان علائی کے نام ہے۔

خود منشی نولکشور نے اپنی اس ملاقات کا حال بڑی عقیدت مندی کے ساتھ اودھ اخبار میں شایع کیا اور نہایت گرمجوشی اور احترام سے ان کا ذکر کیا:

جناب فیض مآب یگانہ، سحر پرواز، نکتہ سنج، سراپا اعجاز، رنگ فزای نازک

خیالی، دقیقہ یاب، فکر و نظر، آموز گار اہل ہنر، فراز ندہ نوای سبحانی، نوزاندہ کوس شیوا بیانی، تاثر نفحات یکتائی در مشارق و مغارب، جناب اسداللہ خاں غالب کی ملاقات سے مشرف ہوا۔ عنایت ایزدی ہے کہ ایسے وحید عصر یگانہ آفاق، سر آمد فضلای روز گار، آفتاب اقلیم فضل و کمال سے ملازمت حاصل ہوئی۔"

اس عبارت کو پڑھکر اور اس عقیدت کا اظہار دیکھکر جو منشی صاحب نے غالب کے لئے کیا ہے ان کے علم و فضل کی جس شد و مد سے تعریف کی ہے، یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں صاحبان علم کے لئے کس قدر عزت اور احترام تھا۔ غالب ہی کی سفارش پر نو لکشور نے قدؔر بلگرامی کو جو یگانہ روز گار عروضدان اور عالم اور عروض و قافیہ کی معرکتہ الآرا کتاب قواعد العروض کے مؤلف تھے، اپنے مطبع سے وابستہ کیا تھا۔ اس کا حال ان خطوط سے معلوم ہوتا ہے جو غالب نے قدر بلگرامی کو لکھے اور جو "غالب کے خطوط" مرتبہ ڈاکٹر خلیق انجم میں موجود ہیں۔ خود منشی نو لکشور سے انکی خط و کتابت کا سلسلہ غالب کی وفات تک جاری رہا۔ غالب کی فارسی کتابیں نو لکشور نے ایسے شوق و شغف اور اہتمام سے شایع کروائیں کہ مرزا کے دل میں ان کے لئے بڑی جگہ اور محبت پیدا ہو گئی دیکھیے قاطع برھان کی تقریظ میں، جو مطبع نو لکشور سے شایع ہونے والی ان کی پہلی کتاب تھی، غالب جیسا شخص کسی طرح Superl atives میں ان کی وضعداری، خلوص اور علم دوستی کا وصف کرتا ہے۔ اور ان کا شکریہ ادا کرتا ہے۔

"سپاس مردی و مہرورزی آن مردم چشم مہرورزی و مہر سپھر مردی، آن بہ دانش گراں مایہ و آن بہ جاہ بلندپایہ، سر اپادانش و ہمہ تن بینش منشی نو لکشور بجای آر۔"

نو لکشور نے نہ صرف فارسی کتب کی طباعت کا کام بے انتہا تن دہی اور سر گرمی سے کیا، بلکہ وہ خود بھی فارسی میں تصنیف و تالیف کرتے تھے، اور شعر بھی کہتے تھے۔ ان کی فارسی نثر کا ایک عمدہ نمونہ ان کی وہ تقریظ ہے جو انھوں نے انوار حسین تسلیم سہسوانی کی تاج المدائح کے لئے لکھی

تھی۔

درخور حمد و ثنا خالق است کہ شغل سخن را نہال ساخت........

خیر خواہ انام نو لکشور نام، سخن سر بستہ رالبفرض می آرد......

مثنوی مولانا روم کو طبع کرتے وقت انھوں نے اس کا منظوم دیباچہ فارسی میں لکھا۔یہ منظوم دیباچہ فارسی زبان پران کے تبحر اور خوش گوئی کا ثبوت ہے۔

حمد نذر کبریای ذوالجلال　　نور او شمس منزہ از زوال

ہم چو ذرات انبیاء واولیا　　از تجلی جمالش پر ضیا

ہم بقدر ظرف در مرآت شاں　　شد زنورلم یزل لمعی عیان

وآنکہ بود آئینہ اش مثل قمر　　پر تو کامل درو شد جلوہ گر

۱۔ عزیز احمد، آج کل، دہلی، جون ۱۹۴۵ء

۲۔ ناظر کاکوروی، ''اردو کے ہندو ادیب''۔انوار بک ڈپو۔لکھنؤ

۳۔ امیر حسن عابدی، نیا دور نو لکشور نمبر ۱۹۸۰ء

۴۔ ناظر کاکوروی، اردو کے ہندو ادیب۔

تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا عمل اور منشی نولکشور

پروفیسر ابوالکلام قاسمی
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تہذیبوں کے عروج وزوال کا عمل ایک قسم کا فطری اور خود کار عمل ہوتا ہے جس کے نتیجے میں تاریخ کے ساتھ تہذیب کا باہمی تعامل یا تو صورت پذیر ہوتا ہے یا پھر تاریخ اپنا سفر جاری رکھتی ہے اور تہذیب اس کی رفتار کا ساتھ نہ دے پانے کے باعث گرد راہ بن کر رہ جاتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی ایک ایسی جنگ آزادی تھی جو غلامی کے استحکام کے ساتھ ہی شروع ہو گئی اور اس جنگ میں مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں کی متوازی شرکت نے جہاں ایک طرف یہ ثابت کیا کہ مغلیہ حکومت پر مشتمل صدیاں ہندوستانی عوام کے لئے مذہب وملت کی تفریق سے ماورا باہمی اعتماد کی صدیاں تھیں وہیں اس جنگ آزادی میں ہندوستانی عوام کی ناکامی نے در حقیقت اس کی غلامی پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال میں شکست خوردگی مایوسی اور مستقبل سے متعلق توقعات کا فقدان ایک قسم کا عوامی طرز احساس بن گیا، جس کے تدارک کی تدبیریں مختلف انداز اور مختلف سطحوں پر کی گئیں ایک طرف برھمو سماج کی تحریک اس طرز احساس کے ازالے کی ایسی سبیل تھی جس کا محور ہندو سماج کی اصلاح اور توھم پرستانہ رسم ورواج کی بیخ کنی تھی دوسری طرف سر سید احمد خاں نے علی گڑھ تحریک کے ذریعہ راجہ رام موہن رائے ہی کی طرح اپنی اصلاحی اور تعلیمی کوششوں کے ذریعے مسلم معاشرے کی سماجی اور تہذیبی نشو ونما اور بیداری کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اس طرح ان دونوں مصلحوں نے مذہبی اور ملی سطح پر اپنے لائحۂ عمل کو محدود اور مرکوز کر کے زیادہ انہماک اور انضباط کے ساتھ احیا اور بیداری کے مشن کو جاری رکھا، مگر عین اس

زمانے میں منشی نولکشور نے بھی اپنی تہذیبی اور عملی جدوجہد کا آغاز کیا یہ جدوجہد بادی النظر ایک کاروبار اور تجارت کے مترادف تھی مگر اصلاح کا نام لئے بغیر ان کی طباعتی سرگرمیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تفریق سے ماورا ہو کر ایک ایسی تہذیب کے نشاۃ ثانیہ کی کاوش کا آغاز کیا، جس کے قیام اور استحکام میں ہندوستان میں بسنے والے ہندوؤں اور ان کی کل تہذیب کو بعض نئے پہلوؤں سے آشنا کرنے والے اور فنون لطیفہ میں جمالیات کی غیر معمولی رفعتوں کا احساس دلانے والے مسلمانوں نے اشتراکی طور پر حصہ لیا تھا۔

منشی نولکشور کی تعلیم وتربیت میں ان تمام تہذیبی عناصر کا رشتہ ایک تھا جن کے باعث مذہبی لسانی اور علاقائی وسیع المشربی کو فروغ مل سکتا تھا چنانچہ اپنے مذہب کی بنیادی اقدار کے ساتھ دوسرے مذاہب سے رواداری کا برتاؤان کے تاجرانہ مشن کا بھی حصہ بن گیا جہاں ان کو سنسکرت اور ہندی سے لگاؤ تھا وہیں فارسی اور اردو سے ان کی وابستگی محض کاروباری نہ ہو کر جذباتی اور فطری نوعیت رکھتی تھی شاید اس موقع پر اس وضاحت کی ضرورت نہیں کہ آج سے سوڈیڑھ سو سال پہلے ان زبانوں کو مخصوص مذاہب سے وابستہ نہیں کیا گیا تھا یہی سبب ہے کہ نولکشور کا مطبع دوسری زبانوں میں کتابیں چھاپنے کے باوجود بنیادی طور پر اردو اور فارسی کتب ورسائل کی اشاعت کا سب سے بڑا ہندوستانی وسیلہ بن گیا تھا۔ نولکشور کے سے کم وبیش چار ہزار کتابین شائع کی گئیں چار ہزار کتابوں کی اشاعت کا ذریعہ ایک بے جان پریس یا چھاپہ خانہ نہ تھا بلکہ کتابوں کی تیاری اور ان کی فراہمی متراجم اور تلخیص اور تصنیف و تالیف کے پورے عمل میں تنظیمی اور تحریکی شان سی پیدا ہو گئی تھی جس کے نتیجے میں وہ کتابیں معرض تصنیف میں آتی تھیں جن کی تیاری اور اشاعت کا آخری مرحلہ اس مطبع کے ذریعہ طے کیا جانا تھا اور اسی مطبع کے ذریعہ منشی نولکشور کتابوں کی تفصیل اور ترویج و تشہیر کا فریضہ بھی انجام دیا کرتے تھے۔

جب تک مغلیہ حکومت کو استحکام حاصل تھا اس وقت تک دہلی اور حکومت دہلی کو مرجع خلائق کی حیثیت حاصل تھی۔ علماء، شعراء وادیب وفنون لطیفہ کے ممتاز ماہرین اور دانشوروں کی پوری کہکشاں دہلی اور سلاطین دہلی کی بدولت تابندہ ودرخشاں تھی مگر جیسے ہی مغلیہ سلاطین پر ادبار کے بادل چھانے لگے کاملین علم وفن نے لکھنؤ کو اپنا مرکز ومحور بنانا شروع کیا یہ صورت حال تقریباً سو سال تک لکھنؤ کے ساتھ وابستہ ہو گئی۔ اور اودھ کا پورا خطہ گویا نعم البدل بن گیا مگر ۱۸۵۷ء میں سلطنت اودھ کے لیے متنازع کے ساتھ مشرقی علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا یہ گہوارہ بھی انتشار کا شکار ہو گیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ علماء وفضلاء کی محفلیں درہم برہم ہونے لگیں علم وفن اور شعر وادب کا سرمایہ ہر زمانہ میں تحریر وطباعت کے ذریعہ محفوظ ہوتا رہا حتی کہ ان ادوار میں بھی جب پرنٹ میڈیا کو فروغ حاصل نہیں ہوا تھا اس وقت بھی جو چیزیں مخطوطات اور تحریروں کی شکل میں محفوظ ہو گئیں ان ہی کی بدولت علوم وفنون کا سلسلہ اگلی نسل اور بعد کی صدیوں تک منتقل ہوا اس میں کوئی شک نہیں کہ تہذیب وتمدن کے تحفظ کا تعلق انسانی برتاؤ اور طریق زندگی سے زیادہ وابستہ ہوتا ہے، اور عادات واطوار کے تسلسل کے ساتھ ہی ثقافت کی قدریں آگے بڑھتی ہیں مگر کتابیں جس تہذیبی سرمایہ کے تحفظ کا فریضہ انجام دیتی ہے ان کا متبادل کسی اور تہذیبی مظہر میں تلاش نہیں کیا جاسکتا چنانچہ منشی نولکشور نے ایک طرف تو اپنے مطبع سے ایسی کتابوں کی اشاعت کا نظم ونسق استوار کیا جو علم وتہذیب کا سرچشمہ تھیں۔ اور دوسری طرف اپنی نگرانی میں مختلف علوم وفنون پر کتابیں لکھوانے تاریخ کو محفوظ کرانے اور منتشر ہوتے ہوئے تہذیبی شیرازے کو مجتمع کرنے کی طرف توجہ مبذول کی۔ لکھنؤ کے انحطاط کے ساتھ علم ودانش اور فن وثقافت کے جو نمائندے دوسرے علمی اور ادبی مراکز کی جانب منتقل ہونے لگے تھے منشی نولکشور نے ان کے لئے قریب قریب اس نوع کے سہارے کا کام کیا جو ان سے قبل حکومت اور حاکموں کی

سرپرستی کی صورت میں جاری رہ چکا تھا۔ منشی جی کا ایک بڑا کارنامہ یہ بھی تھا کہ انہوں نے برباد ہوتے ہوئے علمی ذخائر کو نئے سرے سے اشاعت وطباعت کے مراحل سے گزارا۔ وہ کتابیں جو بہت معمولی قیمت پر فروخت ہونے لگی تھیں اور جن کا کوئی پرسان حال نہیں رہ گیا تھا انہوں نے ایسی کتابوں کی تحفظ کو یقینی بنایا۔

قدیم مشرقی تہذیب کے بیش تر عناصر اردو کی داستانوں میں محفوظ ہیں اور جیسا کہ ہمیں معلوم ہے کہ داستانیں زبانی روایت کا حصہ تھیں اور ان کا سلسلہ سینۂ بہ سینہ منتقل ہو کر ہی محفوظ سمجھا جاتا تھا، منشی نولکشور نے زبانی روایت یا Oral tradition کے بعض بچے کھچے نمائندوں کو اس طرح ایک مرکز پر مجتمع کر دیا کہ داستاں گو حضرات کی خدمات معاوضتاً حاصل کی گئیں اور ان کو داستان سنانے پر مامور کیا گیا۔ حکمت عملی یہ تھی کہ داستاں گو اپنی روایتی شان سے داستان بیان کیا کرتا تھا اور ایک سے زیادہ لکھنے والے نہایت سرعت اور کمال انضباط کے ساتھ داستان کو قلم بند کیا کرتے تھے اس طرح پرانی داستانوں کی حفاظت اور کتابوں کی شکل میں مرتب ہونے کی سبیل پیدا ہوئی۔ اس بات کا صرف اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر داستانوں کے تحفظ کا ایسا کوئی انتظام نہ کیا جاتا تو آج کی صورت حال میں جب پرنٹ میڈیا بھی معرض خطر میں ہے اور ذرائع ابلاغ نے زبانی روایت کا تقریباً خاتمہ کر دیا ہے، داستانوں کے وسیلے سے محفوظ ہو جانے والی تہذیبی اقدار اور ثقافتی عناصر کی بقا ہی مشتبہ ہو کر رہ جاتی۔ فارسی اور اردو میں داستانی بیانیہ کے جو اسالیب بعض قدیم داستانوں کی بدولت محفوظ ہو گئے ہیں ان میں ایک بڑا حصہ منشی نولکشور کی اس حکمت عملی کا ہے جس کے باعث داستانوں کے قلم بند کرنے اور کتابی صورت میں شائع کرنے کا اہتمام کیا گیا تھا ان داستانوں نے زبان کے اسالیب کے ساتھ انسانی ذہن کے ارتقاء، تخئیل کی بے پناہی، رسوم و رواج، انسانی عادات واطوار اور زندگی گزارنے کے انداز اور علم و فن کے ساتھ صنعت حرفت میں ماہرانہ چابک

دستی تک کو محفوظ رکھا ہے۔ ان کتابوں کے وسیلے سے جہاں ہم مشرقی تہذیب کی پوری روایت کو سمجھ سکتے ہیں وہیں قصہ گوئی کے قدیم اسالیب کی تحدید کا کام بھی انجام دے سکتے ہیں۔ نو لکشور کے مطبع نے داستانوں کی اشاعت کا جو منصوبہ مرتب کیا تھا اس کی وسعت اور دور رسی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ آج بھی داستان امیر حمزہ، طلسم ہوشربا اور اس سلسلے کی کم و بیش اسی جلدیں اسی مطبع کی بدولت مطبوعہ صورت میں موجود ہیں ان مین سے بہت کم داستانین ایسی ہیں جن کو بعد کے کسی اور اشاعتی ادارے نے نئے سرے سے شائع کیا ہو۔ ان داستانوں میں آفتاب شجاعت، لعل نامہ، طلسم فتنہ نور افشاں، بہومان نامہ اور طلسم نوخیزی جمشیدی وغیرہ کو خاص اہمیت حاصل ہے طلسم ہوشربا کی تمام جلدیں اور بوستان خیال کی جلدیں بھی اسی منصوبے کے تحت شائع پذیر ہوئیں۔ امیر حسن نورانی کا بیان ہے کہ نثری داستانوں کی تقریباً مزید چالیس جلدیں مختلف ناموں سے غیر مطبوعہ حالت میں ماضی قریب تک نو لکشور بک ڈپو کے محافظ خانے میں موجود تھیں۔

اردو کی نثری داستانوں کے ضبط تحریر میں آنے کے باعث تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے جو امکانات پیدا ہوئے ان کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ داستانوں کے سرمایے پر، تہذیبی، ثقافتی، لسانی اور حکائی نقطہ نظر سے جو بھی تنقیس لکھی گئی ہے اس کا انحصار بالعموم نو لکشور پریس سے شائع شدہ جلدوں پر رہا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس ضمن میں مطبع نو لکشور نے اپنی کاوشوں کا سلسلہ داستانوں تک ہی محدود نہیں رکھا بلکہ داستانوں کی اگلی کڑی کے طور پر قصہ کہانیوں کے اسلوب میں بیان کئے جانے والے تہذیبی بیانیہ کی اشاعت کا کام اس مطبع نے اپنے رسالے اودھ ریویو اور اودھ اخبار کے ذریعہ بھی جاری رکھا اور کتابی صورت میں بھی حکائی ادب کی اشاعت پر خاص توجہ صرف کی۔ یہی وجہ ہے کہ رتن ناتھ سرشار کا غیر معمولی تہذیبی مرقع "فسانہ آزاد" نے اس وقت کے ماضی قریب کے لکھنوی تمدن اور ثقافت

کو اس کی تمام جزئیات اور نزاکتوں کے ساتھ منظر عام پر لانے اور دستاویزی طور پر محفوظ کرنے کا کام سر انجام دیا۔ فسانۂ آزاد کو بالضمن داستان اور ناول کی اصناف کے درمیان کی کڑی تصور کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ فسانۂ آزاد اردو کے ابتدائی ناولوں میں سے ایک ایسا غیر معمولی اور اہم ناول ہے جس کو تہذیبی مرقع کشی کے معاملے میں وہی اساسی حیثیت حاصل ہے جیسی مرزا رسوا کے ناول امراؤ جان ادا کو اس فرق کے ساتھ کہ امراؤ جان ادا، کی کہانی حقیقت نگاری کی وثوق انگیز صورت کو پیش کرتی ہے جب کہ فسانۂ آزاد کا بیانیہ لکھنوی تہذیب کو اس کی تمام افراط کے ساتھ سامنے لاتا ہے کہ بسا اوقات جزئیات نگاری حقیقی صورت حال کے کیریکچیر کی شکل اختیار کر لیتی ہے مگر اس کے ساتھ ہی یہ نہ بھولنا چاہئے کہ لکھنوی ثقافت میں اگر توازن کا فقدان قدرے تمسخر کی سطح پر نہ آ گیا ہوتا تو عین اس کے عروج کی داستان بیان کرتے ہوئے رتن ناتھ سرشار اس میں برایت کرنے والی دیمک کا اس طرح مشاہدہ نہ کر لیتے جس طرح انہوں نے فسانۂ آزاد میں لکھنوی کلچر کو اس کے تمام تضادات کے ساتھ پیش کر کے کیا ہے ایسے موقع پر اندازہ ہوتا ہے کہ حقیقت کیوں کر حکایت کا روپ اختیار کر لیتی ہے اور تہذیب کی روح تہذیب اور تنقید کی ہم آہنگی کے ذریعے کیسے نمایاں کی جا سکتی ہے۔

نولکشور پریس ۱۸۵۸ء میں یعنی پہلی جنگ آزادی کے صرف ایک سال بعد قائم ہو گیا تھا جس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی ۱۸۵۷ء کے ہنگاموں اور ہندوستانی عوام کی ہزیمت کا احساس پوری طرح اجاگر بھی نہ ہو سکا تھا کہ منشی نولکشور نے اپنی معاصر صورت حال کے عواقب کا اندازہ لگایا تھا اور انہوں نے ضرورت محسوس کی تھی کہ اشاعت و طباعت کے تاجرانہ عمل کے ذریعہ بالواسطہ طور پر کیوں کر علوم و فنون اور تہذیبی اقدار کو انتشار سے بچایا جا سکتا ہے اس موقع پر یہ تسلیم کرنے کے باوجود کہ منشی نولکشور نے بظاہر اپنے پریس کو کاروبار کے مقصد سے قائم کیا تھا مگر بعد کے حالات اور اس پریس کے بانی کے طریق کار نے اس بات کو

باور کرانے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھار کھا کہ وہ اپنے پریس سے اودھ اخبار کے نام سے نہایت عظیم الشان اخبار جاری کیا جو اپنی معاصر زندگی اور ہم عصر تہذیب اور ادبی صورت حال کا آئینہ تھا یہ اخبار ابتداء میں ہفتہ وار کی شکل میں جاری ہوا تھا مگر اامتداد وقت کے ساتھ سہ روزہ اور بعد کے برسوں میں کچھ عرصے کے لئے روزنامہ کی صورت میں شائع ہوا اس اخبار میں دنیا بھر کی سماجی اور سیاسی خبروں کے ساتھ عدالت اور مونسپل کمیٹی کی کارروائیاں، ریلوے سے متعلق اشتہارات واطلاعات، ادبی اور ثقافتی انجمنوں اور جلسوں یا تقریبات کی تفصیلی روداد، شعراء کا کلام، ادبی معرکوں سے متعلق تحریریں غرض کہ انیسویں صدی کے نصف آخر کی وہ تمام معلومات شامل کی جاتی تھی جو کسی معیاری اخبار اور رسالے کے لئے جامعیت اور معیار کی ضمانت ہوسکتی تھی۔ اس اعتبار سے اودھ اخبار، اخبار اور اور مکمل ادبی یا ثقافتی جریدے کا نعم البدل بن کر عرصہ دارز تک اشاعت پذیر ہوتا رہا۔ اودھ اخبار میں منشی نولکشور صرف ایک ناشر کی حیثیت سے پس منظر کا کام انجام نہیں دیتے تھے بلکہ ادارتی ذمہ داریوں کا بار، اڈیٹریا ادارتی عملے کی موجودگی کے باوجود بالعموم منشی نولکشور کے ہی کاندھوں پر تھا منشی جی کے نوٹ ادارتی باتیں اور متنازعہ فیہ مسائل پر ان کا نقطہ نظر اکثر وبیش تر اودھ اخبار کے ذریعے سامنے آتا رہتا تھا اودھ اخبار میں صحافتی دیانتداری کا یہ معیار تھا کہ اخبار کی پالیسی کی موافقت اور مخالفت میں ہر طرح کی آراشائع ہوا کرتی تھیں۔ مگر ان کے ساتھ ہی ادارے کا نقطۂ نظر بھی ضرور موجود ہوا کرتا تھا۔ اردو اور ہندی کے جھگڑے میں اس اخبار کے صفحات پر اردو کی مخالفت اور موافقت میں مضامین ضرور شائع کئے گئے مگر نولکشور نے خود اپنی رائے اس ضمن میں کبھی محفوظ نہ رکھی اور کھلے طور پر ہندی زبان پر اردو کی فوقیت کا اظہار ان الفاظ میں کیا کہ " یہ زبان مسلمانوں اور ہندوں کے خلط ملط سے بالکل اسی طرح وجود میں آئی جیسے انگلستان میں سیکس اور فرانسیسی کا امتزاج عمل میں آیا۔ اردو میں دوسری زبانوں کے وہی الفاظ استعمال

ہوتے ہیں جو کھپ جائیں اور ان الفاظ کے استعمال میں خاص سلیقہ برتا جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اردو کو عدالتوں میں مقبولیت حاصل ہوئی اور سرکاری تحریرات میں یہ زبان استعمال کی گئی اور یہ کہ ان تمام باتوں کی تائید میں خود ہزاروں ہندوؤں کی آرا پیش کی جاسکتی ہیں ''متناعہ فی مسائل میں منشی نولکشور کے اپنے نقطۂ نظر کی یہ صرف ایک مثال ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی پالیسی کیسی غیر متعصّبانہ اور حقائق پر مبنی ہوا کرتی تھی۔ اودھ اخبار کی غیر معمولی اہمیت کا اندازہ اس بات سے بھی لگا تا جاسکتا ہے کہ اس کی ادارت سے جو لوگ وابستہ رہے ہیں ان میں ممتاز ترین ادیب، مولوی ہادی علی اشک، مولوی رونق علی رونق، غلام محمد تپش، رتن ناتھ سرشار، راجہ شیو پرساد، مولانا احمد علی شوکت میرٹھی جیسے علماء اور اہل قلم تھے۔ اودھ اخبار کی بنیادی پالیسی کے طور پر ہندوستانی ادبیات کی خدمت اور مشرقی اقدار کی ترویج شامل تھی شاید یہی سبب تھا کہ غالب نے اپنے ایک خط میں لکھا تھا کہ ''اس چھاپہ خانے نے جس کسی کا دیوان چھاپا ہے اس کو زمین سے آسمان پر پہنچادیا'' اودھ اخبار کی بے باکی کا یہ عالم تھا کہ برٹش حکومت کے دور عروج میں ایک مضمون ہماری آزادی کے عنوان سے شائع کیا گیا جس میں آزادی کے پیدائشی حق کے سلب کئے جانے کا نہایت حقارت سے ذکر کیا گیا اور ہندوستانیوں کی آزادی کا مطالبہ زور شور سے اٹھایا گیا تھا مزید برآں یہ کہ اس اخبار میں عرصے تک پہلی جنگ آزادی کے متعدد گم نام مجاہدوں کے کارنامے قسط وار شائع ہوتے رہے اخبار کی پالیسی اور مقاصد کے باعث کئی موقعوں پر ان کی اشاعت دس اور بارہ ہزار تک پہنچ گئی تھی۔

اودھ اخبار کی خدمات کو نولکشور پریس سے الگ کر کے نہیں دیکھا جاسکتا یہی وجہ تھی کہ پریس اور اخبار ایک دوسرے کے لئے جزو لاینفک سے بن گئے تھے اس اخبار اور ادارے سے ۱۸۵۷ء کے بعد کا شاید ہی کوئی اہم اور ممتاز عالم، دانشور اور ادیب ہو جو کسی نہ کسی طور پر وابستہ نہ رہ چکا ہو۔ مراز غالب اور سر سید احمد خاں کی وابستگی اس سلسلے کی سب سے اہم

مثالیں ہیں۔ سر سید احمد خاں کی تحریک کو علمی اور ادبی بنیادوں پر آگے بڑھانے میں اودھ اخبار نے ناقابل فراموش خدمات انجام دیں سر سید کی تحریریں خواہ وہ سماجی اصلاح سے متعلق ہوں یا مذہبی شخصیات کے تذکرے پر مبنی، اودھ اخبار میں نہایت نمایاں طور پر شائع ہوا کرتی تھیں۔ سر سید نے نولکشور اور ان کے پریس کے علمی کارکردگی کے باعث تہذیب الاخلاق میں متعدد بار اظہار رائے کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ اس زمانے کے اخبارات ورسائل اودھ اخبار کی تقلید کریں۔ انہوں نے اس رائے کا بھی اظہار کیا کہ اودھ اخبار نمائندہ انگریزی اخبارات کا مقابلہ کر سکتا ہے اور اسکی بدولت اردو صحافت انگریزی صحافت سے آنکھیں ملانے لگی ہے۔

مرزا غالب اور نولکشور کے رابطہ کا صحیح اندازہ خطوط سے لگایا جاسکتا ہے یوں تو غالب اس پریس کی کارکردگی کے ہی مداح تھے مگر جب دہلی کے ایک سفر کے دوران نولکشور نے غالب سے ملاقات کی تو غالب پر ان کی شخصیت اور برتاؤ کا نقش زیادہ گہرا ہو گیا۔ اسی باعث غالب نے علاء الدین علاقی کے نام اپنے ایک خط میں ان کے چہرے بشرے اور شخصیت کی تعریف ان الفاظ میں کی کہ "خالق نے ان کو زھرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطاء کی ہے بجائے خود وہ قرآن السعدین ہیں" اسی طرح مراد علی خاں امضا کے نام اپنے مکتوب میں لکھا کہ "بہت خوبصورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں تمہارے وہ مداح ہیں اور میں ان کا ثناخواں" مرزا غالب کے ان بیانات کا انحصار بظاہر منشی نولکشور کی شخصیت سے متعلق نظر آتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مرزا اپنے کلام کی اشاعت کے لئے اودھ اخبار کو اور اپنی کتاب کی اشاعت کے لئے نولکشور پریس کو معیاری اور مثالی ذرائع ابلاغ تصور کرتے تھے۔ نولکشور سے مرزا غالب کے روابط کا آغاز ان کے فارسی دیوان کے دوسرے اڈیشن کی اشاعت کے معاملے سے ہوا، بعض مواقع کی وجہ سے ان کا دیوان فارسی "میخانۂ آرزو" ضروری اضافوں کے ساتھ کلیات فارسی کی صورت میں خاصی تاخیر سے (۱۸۶۳ء میں)

شائع ہوپایا مگر مجموعی طور پر غالب کی کئی کتب مثلاً برہان قاطع، کلیات نثر اور دیوان غالب کی اشاعت کا شرف بھی نولکشور ہی کو ملا۔

ہندوستان کی ممتاز ترین شخصیتوں کی طرف منشی نولکشور کی توجہ اور ان کے کارناموں کی تشہیر واشاعت کے ہر ممکن ذریعے کا اہتمام درحقیقت لکھنؤ، مشرقی علوم اور اردو وفارسی کے حوالے سے تہذیبی نشاۃ ثانیہ کی ایک مہم تھی جس میں پورے ہندوستان کے اشاعتی اداروں کے مقابلے میں نولکشور پریس کی خدمات سب سے زیادہ مہتم بالشان ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ منشی نولکشور نے علمی اور تہذیبی اقدار کی ایک مہم سی چلا رکھی تھی جس مین ان کے ساتھ وہ تمام اہل علم وکمال شریک تھے جن کی ترسیل وابلاغ کا سب سے ممتاز وسیلہ منشی نولکشور ثابت ہوئے۔ اودھ اخبار دراصل اپنے عہد کی مرتب ہوتی ہوئی علمی اور ادبی تاریخ کا منظرنامہ تھا جس میں سرسید غالب ،انیس، مرزا حاتم علی خاں، منشی ہرگوپال تفتہ، کلب علی خاں نادر، مردان علی رعنا،اور محسن الملک سے متعلق وسیع معلومات مندرج ہوا کرتی تھیں۔

ان معروضات کے پس منظر میں یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ نولکشور پریس محض ایک چھاپہ خانہ نہیں بلکہ علمی وتہذیبی اقدار وعناصر کا محافظ خانہ اور میوزیم تھا جس کی بدولت مشرقی تہذیب وتمدن کے مظاہر کا محض احیاء نہیں ہوا بلکہ ان تمام مظاہر کو مستقبل سازی کے عمل میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ اس نقطۂ نظر سے منشی نولکشور اور نولکشور پریس کو تہذیبی نشاۃ ثانیہ کا ایک ایسا غیر معمولی وسیلہ قرار دیا جاسکتا ہے جس نے اصلاحی تحریکات اور بعض مصلحین سے کہیں زیادہ کارگر خدمات انجام دی ہیں۔

قطرہ سے گہر...

ڈاکٹر قمر غفار

جامعہ ملیہ اسلامیہ

پروفیسر سید نبی ہادی صاحب نے اپنی کتاب میں "مغلوں کے ملک الشعراء" میں لکھا ہے "تقدیر کا فرشتہ بعض اوقات نہایت گمنام لوگوں کو دیکھ کر مسکراتا ہے اور ان کو اپنے قوی بازوؤں میں بٹھا کر بقائے دوام کی بلندیوں کی سمت اڑنے لگتا ہے۔ دنیا سمجھتی ہے اور افسوس کرتی ہے کہ وہ تباہی اور دست برد زمانہ کا شکار ہو گئے۔ وہی دست و بردان کے عروج کی راہ کا نقطۂ آغاز بن جاتی ہے" ایسا ہی کچھ بابو جمنا پرشاد بھار گو کے فرزند دلبند نو لکشور کے ساتھ ہوا۔ آگرہ کالج کے پانچ سال محنت و لگن سے پورا کرنے کے زمانہ ہی میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ اس ہی شوق نے کالج کی تعلیم کا سلسلہ ترک کرا کے میدان صحافت میں قدم رکھوایا اور صحافت کی دنیا میں زندہ جاوید ہو گئے۔ ان کی عالم و فاضل نیز فعال شخصیت نے حافظ کے شعر کی تفسیر پیش کر دی۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

لیکن منشی نو لکشور نے دنیائے علم و دانش میں نہ صرف اپنی شخصیت کو جاودانی بنایا، اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا بلکہ اہل علم و ادب کو اپنا مرہون منت بھی بنا گیا، جس کی تلافی بھی ممکن نہیں۔

منہاج سراج جوزجانی، صاحب طبقات ناصری، کے مطابق خداوند متعال ایسی ہستیوں کا انتخاب جن سے اہم کام لینا مقصود ہوتا ہے روز اول ہی چن لیتا ہے اور پھر اس کے

حرکات و سکنات، عادات و اطوار ہی سے ان کی صفات آئندہ کا آئینہ بنا دیتا ہے۔ بقول شخصے " لعل کے پانوں پالنے ہی میں دکھائی دینے لگتے ہیں"۔ منشی صاحب کی زندگی اس کی زندہ تصویر ہے۔ سوچئے ضلع متھرا کے 'ریڑھا' دیہات میں ماہ دسمبر ۱۸۳۶ء میں پیدا ہونے والا قدر و منزلت کی ان بلندیوں پر پہنچے گا، کون جان سکتا تھا۔

"بہر حال زبان پہ بار خدایہ کس کا نام آیا" کہ مختلف علوم و فنون اور متعدد زبانوں کی ہزاروں کتابوں، مطبعوں، خطاطوں خوش نویسوں، اخباروں بالخصوص اخبار اودھ کے تصور سے دل و دماغ میں حیرت انگیز انبساطی کیفیت طاری ہو گئی۔

اردو کے ایک ادیب عزیز احمد نے لکھا ہے۔

" ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد اگر سر سید احمد خان اور نو لکشور ہندوستان کے تمدنی ورثہ اور ذہنی بیداری کی حفاظت نہ کرتے تو شاید ہندوستان آج ترقی کی دوڑ میں اس طرح جدید اقوام کے ساتھ شانہ جوڑ کر نہ بڑھ سکتا.... اور اگر نو لکشور ان بیش بہا خزانوں کا کھوج لگا کر طباعت کے ذریعہ انہیں زندۂ جاوید نہ بنا دیتے تو ۱۸۵۷ء کے بعد کی گڑ بڑ میں ان کی تباہی یقینی تھی۔ یہ ہمارے تمدن کا اتنا زبردست نقصان ہوتا جس کی تلافی ممکن نہ تھی"۔

بیشک علوم مشرقیہ کی ترویج و اشاعت میں منشی نو لکشور کی خدمات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہیں۔ ہندو پاکستان اور ایران سے لے کر مشرق وسطیٰ کے ممالک میں ان کی شہرت عام ہے۔ یورپ و امریکہ کے مستشرقین نے بھی ان کی خدمات کو سراہا ہے۔

حق تو یہ ہے کہ منشی نو لکشور کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کی گونا گون سرگرمیاں اس سمندر کی مانند ہیں جس کی ہر تہہ میں ایک گوہر بے بہا موجود۔ سب کو ایک مقالہ کے کوزہ میں سمیٹنا نا ممکن نہ سہی مشکل ضرور ہے۔ بس ہماری بحث بھی یہاں نو لکشور کے چند ان اہم معاصرین سے ہے جو خود بھی اپنی جگہ ایک مسلم شخصیت کے حامل ہیں۔

نامناسب نہ ہو گا اگر ایک نظر منشی نو لکشور کے احوال پر بھی ڈالی جائے۔

اپنی زندگی کے تقریباً چھ سال متھرا اور آگرہ میں گذارنے کے بعد نولکشور اپنے آبائی وطن بستوی نزد ساسنی ضلع علیگڑھ چلے گئے جہاں انہوں نے اپنی ابتدائی تعلیم وہاں کے رواج کے مطابق دس سال کی عمر تک مکتب میں پوری کی۔ فارسی بھی سیکھی، ثانوی تعلیم بڑی لگن اور محنت سے گزارے۔ سنسکرت اور انگریزی کی استعداد بہم پہنچائی تحصیل علم کے شائق، ذہانت خداداد، کتابوں کا مطالعہ محبوب مشغلہ، اس ہی شغل نے مضمون نگاری کا شوق پیدا کیا۔ لکھنے کی مشق شروع کی... تھوڑی سی مدت کی لگن اور محنت کے اندر ہی ان کے مضامین شمالی ہندوستان کے مشہور اخبار ''سفیر آگرہ'' میں شائع ہونے لگے اور پسند کئے گئے۔ حکومت نے تشویق علم و حوصلے کے لئے وظیفہ مقرر کردیا۔ کالج سے تعلیم کا سلسلہ ترک کرکے میدان صحافت میں قدم رکھا۔ اردو زبان وادب سے بہت زیادہ شغف تھا، الغرض سترہ سال کی عمر میں خاصی شہرت حاصل کرلی۔ اس ہی وقت ''کوہ نور'' اخبار لاھور کے ایڈیٹر منشی ھر سکھ رائے نے نولکشور کو اپنے اخبار میں کام کرنے کی دعوت دی۔ ذوق صحافت نگاری میں کم معاوضہ صرف دس روپیہ ماھوار پر بھی انہوں نے اس پیش کش کو منظور کرلیا۔ اخبار اور مطبع کا کام بڑی جانفشانی اور دلسوزی سے انجام دیا۔ منشی ھر سکھ رائے ان سے بہت مطمئن اور خوش تھے۔

۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی کے اوایل میں منشی نولکشور اکیس سال کے تھے اور لاھور میں رہتے چار سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ تحریک آزادی ہندوستانیوں اور انگریزوں کے درمیان جنگ کی صورت اختیار کرچکی تھی، یہ وہ زمانہ ہے جب سارے ملک میں جہالت اور افلاس کا دور دورہ تھا۔ اخلاقی قدریں دم توڑ رہی تھیں، اور ایک نئی تہذیب جنم لے رہی تھی۔ جو مغربی تہذیب و تمدن کی حامل تھی وقت کے بدلتے حالات کو منشی نولکشور غور سے دیکھتے رہے ملک کی موجودہ کیفیت سے وہ متاثر تھے۔ ان کے دل میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ موجزن تھا۔ ان حالات میں انہوں نے طے کیا کہ خود اپنا اخبار نکالیں۔ اس لئے اخبار 'کوہ نور' سے مستعفی ہو اپنے اخبار اور مطبع کا پروگرام بنالیا جب ۱۸۵۷ء کے ھنگامہ سرد ہوا تو لاھور

سے آگرہ آگئے۔ لیکن اپنے منصوبہ کو عملی شکل دینے کے لئے وہاں کی فضا سازگار نظر نہ آئی تو لکھنؤ کا رخ کیا جو صدیوں سے علوم و فنون کا گہوارہ تھا۔ اگرچہ ۱۸۵۷ء کی ھنگامہ خیزیوں نے لکھنؤ کو بھی متاثر کیا تھا مگر "ہاتھی لٹا پھر بھی سوالاکھ کا" مشرقی تہذیب اور علم و فن کا چراغ ابھی گل نہیں ہوا تھا، منشی نولکشور کی ذہانت اور دور بین نگاہوں نے اس شہر کی اہمیت کا اندازہ کر لیا تھا پس اپنا ملجا و ماوا اس کو قرار دیا۔

۱۸۵۸ء کے اوائل میں منشی نولکشور لکھنؤ پہنچے۔ اور آغا میر کی ڈیوڑھی میں ایک چھوٹا سا مکان کرایہ پر لیا۔ جہاں چھوٹے پیمانے پر اپنے کام کا آغاز کیا۔ کچھ عرصہ بعد گولہ گنج منتقل ہوئے پھر چند دنوں بعد محلّہ رکاب گنج میں راجہ مان سنگھ کی کوٹھی میں مناسب جگہ حاصل کر لی۔ لکھنؤ کے انگریز کمشنر کرنل ایبٹ کی ترغیب سے مطبع قائم کیا۔ اپنے وقت کے صاحب علم و فضل مولانا احسن کاکوروی کی مالی اعانت سے مطبع کا کام آگے بڑھایا۔ اور کچھ عرصہ بعد "اخبار اودھ" جاری کر کے اپنا خواب پورا کیا۔ ۲۶/ نومبر ۱۸۵۸ء کو اودھ کا پہلا شمارہ شایع ہوا جو چار صفحات پر مشتمل تھا۔ اخبار کا نام بھی انہوں نے نہایت دلکش، مناسب اور تاریخی پس منظر کی رعایت سے رکھا جو ان کی ذہانت اور خوش ذوقی پر دال ہے۔ اودھ اخبار کو خوب شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے نمایندے تمام بڑے شہروں میں پھیل گئے۔ اور اس زمانہ میں مشہور ہوا کہ صوبوں اور ریاستوں کی راجدھانی میں حکومت کے نمایندہ رہتے ہیں یا نولکشور کے۔

وہ بڑے مردم شناس آدمی تھے۔ ان کی کوششوں سے بڑے بڑے اہل علم گمنامی کے غار سے باہر آئے اور اتنے مشہور ہوئے کہ آج علمی و ادبی دنیا کو ان پر فخر ہے۔ بقول ناظر کاکوروی:

"لکھنؤ میں جس قدر مشہور حافظ، عالم، مورخ ادیب اور شاعر اس مطبع میں بیک وقت جمع ہوگئے تھے ہندوستان کے کسی دوسرے مطبع کو نصیب نہ ہوئے"۔

منشی نولکشور کو ملک میں خاص کر علمی دنیا میں بہت ہر دل عزیزی حاصل ہوئی۔

لوگ بلا مذہب و ملت ان کی عزت کرتے تھے۔ شعراء نے ان کی مدح میں اپنا زور قلم دکھایا۔ میرزا غالب نے اپنے ایک مکتوب میں لکھا ہے :

"خدا نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت دی ہے۔ گویا بجائے خود قرآن السعدین ہیں۔" (اردوی معلیٰ) منشی نولکشور نے معمولی سرمایہ سے اپنا کام شروع کیا اور اپنی انتھک محنت، ایمانداری سے اس کاروبار کو ایسی ترقی دی کہ بقول ڈاکٹر سکسینہ "انہوں نے ایک کروڑ کی جائیداد چھوڑی۔ ان کے مطبع کی شاخیں کانپور، لاہور، پٹیالہ، الہٰ آباد، اجمیر شریف اور جبل پور میں قایم ہو گئی تھیں اور ایجنسیاں دھلی پٹنہ، اور کلکتہ وغیرہ میں تھیں۔ لندن میں ان کا نمایندہ موجود تھا۔ اس طرح قطرہ سے گوھر ہونے کا تک عمل پورا ہوا۔

۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء کو انسٹھ سال کی عمر میں اس دارِ فانی کو خدا حافظ کہا اور اپنے پیچھے ایک نہ پر ہونے والا خلا چھوڑ گئے۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

منشی نولکشور کا حلقہ صرف علم و ادب کی دنیا ہی تک محدود نہ تھا کہ ملک کے سیاسی مسائل سے بھی ان کو گہری دلچسپی تھی اور ملک و قوم کی دردمندی کا جذبہ ان کے اندر بدرجہ اتم موجود تھا۔ ایک صحافی کی حیثیت سے اپنے اخبار کے ذریعہ انہوں نے قوم میں بیداری اور آزادی کے جذبہ کو ابھارنے کی کوشش شروع کر دی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگریز حکومت ان کی مدح سرا تھی۔ اور جنوری ۱۸۸۵ء میں حکومت نے انہیں سی۔ آئی۔ اے۔ کا خطاب اور "قیصر ہند" کا خطاب عطا کیا تھا۔ بااین ہمہ وہ اسی سال انڈین نیشنل کانگریس کے بانیوں میں شامل ہو گئے۔ وہ عوام کے حقوق کی خاطر اپنے اخبار "اودھ" میں لکھتے، جرائت مندی کے ساتھ حکومت کے غلط کاموں پر تنقید کرتے۔ حکومت نہ صرف یہ کہ بے خبر نہیں تھی بلکہ ان کی نکتہ چینیوں سے اثر انداز بھی ہوتی۔ ایک دفعہ انگریز حاکم نے ایک مختار کو اس جرم میں کہ وہ جوتا پہن کر صاحب بہادر کے حضور میں حاضر ہوا تھا یہ سزا دی کہ وہی جوتے پیر سے اتروا کر

اس کے سر پر رکھوائے اور عرصہ تک کھڑا رکھا۔ منشی نولکشور نے اس واقعہ پر شدید رد عمل کا اظہار کرتے ہوئے اپنے اخبار کے ذریعہ ہندوستانیوں کو غیرت دلائی اور سخت تاکید کی کہ انگریزی جوتے ہرگز نہ پہنیں۔ (اودھ اخبار شمارہ ۶ مارچ ۱۸۷۶ء)

ملک کی سیاسی تحریکوں میں شمولیت کے ساتھ ان کو ایک سماجی مصلح کی حیثیت بھی حاصل تھی۔ علماء و فضلا، سیاسی سماجی رہنماؤں، والیان ریاست اور روساء سے ان کے اچھے مراسم تھے۔ سرکاری تقریبات میں ان کو ہر موقع پر یاد کیا جاتا تھا۔

حیدر آباد کے وزیر اعظم، مشہور علم پرور نواب مختار الملک سید تراب علی سالار جنگ بھی منشی نولکشور کی صلاحیتوں کا لوہا مانتے تھے اور ان کی قدر دانی کرتے تھے۔ اودھ اخبار کا مطالعہ ان کے معمول میں شامل تھا۔ مارچ ۱۸۷۰ء میں جب سالار جنگ لکھنؤ آئے تو سرکاری حکام اور معززین لکھنؤ نے ان کا پرزور استقبال کیا۔ ان میں امیر الدولہ راجہ میر حسن خان والیٔ محمود آباد اور نولکشور خاص طور پر نمایاں رہے۔

اسی طرح نواب رامپور کلب علی خاں سے منشی نولکشور کے بہت اچھے روابط تھے۔ دونوں میں ملاقات بھی ہوئی اور مراسلات کا سلسلہ بھی برابر جاری رہا۔ نواب صاحب بعض معاملات میں نولکشور سے مشورہ بھی کیا کرتے تھے۔ اور وہ نواب صاحب سے اپنی ذاتی اور قومی ضروریات کے لیے بے تکلف نیز رازداری کے ساتھ مالی امداد لیا کرتے تھے، منشی صاحب کی سفارش پر کئی لوگوں کو دربار رامپور میں جگہ ملی۔ ان تمام خط و کتابت کا ریکارڈ "محکمۂ عالیہ دارالانشاء، پولیٹکل ریکارڈ آفس" رامپور میں محفوظ ہے۔ میرزا غالب کے بعض خطوط سے بھی نواب صاحب اور منشی نولکشور کے روابط کا پتہ چلتا ہے۔ نیز یہ بھی کہ سر سید احمد خاں اور نولکشور میں دوستانہ تعلقات تھے۔ اور وہ اپنے اخبار کے ذریعہ سر سید کی تعلیمی اور اصلاحی منصوبوں کی بھرپور تائید کرتے تھے۔ اگرچہ بعض سیاسی نظریات میں اختلاف بھی پیش آیا مگر ذاتی تعلقات اس سے متاثر نہ ہوئے اور اپنی جگہ قائم رہے۔ اکثر سر سید کے خلاف آئے خطوط

کو اخبار اودھ میں چھاپنے سے گریز کیا جاتا تھا۔ اخبار کے مشہور ایڈیٹر غلام محمد خاں تپش کے ایک خط کے اقتباس سے دونوں کے صمیمانہ روابط کی نوعیت کا بطور وافی اندازہ ہوتا ہے۔

ملاحظہ ہو: جناب فیض مآب حضرت مولوی صاحب قبلہ مدظلہٗ بعد سلام سنت الاسلام، گذارش یہ ہے کہ نیاز مند اور جناب منشی نولکشور صاحب نے آپ کے مضامین تہذیب الاخلاق کا معائنہ کیا، سبحان اللہ ایسے خیالات پاکیزہ اور لطیف ہیں کہ اس کی تعریف نہیں ہو سکتی خدا نے فصاحت اور شیرینی گفتار حضرت پر ختم کر دی ہے۔۔ چنانچہ وہ کل مضمون درج اودھ اخبار کیا گیا، ایک تمہید مناسب بھی چھاپی گئی اور منشی صاحب ممدوح نے فرمایا کہ ہمیشہ اس نیک کام اور ملکی ہمدردی میں اودھ اخبار حتی الامکان مؤید رہے گا۔ اور شورش انگیز خیالات عام جو مختلف اخباروں کے ذریعہ شائع ہوں گے انشاء اللہ اس کی بھی اصلاح کریگا۔ میں نہایت افسوس اور عذر کرتا ہوں کہ بعض ہی نہیں بلکہ اکثر حضرات آپ کے خلاف رائیں لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ پس وہ اول تو بہت کم چھاپی جاتی ہیں اور جو چھاپی جاتی ہیں ان کی تردید میں کبھی نہ کبھی رائے دیدی جاتی ہے۔ اور بہت سے مضامین واپس جاتے ہیں اکثر ردی کے لیے جاتے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ امور کا لحاظ رہے گا۔

رقیمۂ نیاز غلام محمد ایڈیٹر اودھ اخبار (مکاتب غالب، مرتبہ غلام رسول مہر۔ صفحہ ۲۷۵، مطبوعہ لاہور)

امیر افغانستان اور نولکشور : ۱۸۸۵ء میں بادشاہ افغانستان امیر عبدالرحمٰن ہندوستان آئے تھے۔ ان کی آمد کا مقصد تھا کہ کابل و قندھار کی طرف روسی افواج کی پیش قدمی کو روکنے کے لئے ہندوستان کی انگریزی حکومت سے صلاح مشورہ کریں۔ اسی زمانہ میں پنجاب کے شہر لدھیانہ میں گورنر جنرل کا دربار منعقد ہوا جس میں ہندوستان کے والیان ریاست اور معزز امراء بھی شامل تھے۔ خود امیر عبدالرحمٰن بھی موجود تھے۔ منشی نولکشور بھی بلائے گئے اور ان کی نشست والیان ریاست کی صف میں رکھی گئی۔ جس پر اعتراض ہوا۔ گورنر نے یہ کہہ کر لوگوں

کو خاموش کیا کہ ان کی خدمات اور توسیع تعلیم کا یہ اعتراف ہے۔ اثنائے گفتگو امیر عبدالرحمٰن نے نولکشور کا نام سنا تو ان سے ملنے کی خواہش ظاہر کی وہیں ملاقات پر امیر ان سے بڑی عزت و محبت نیز بے تکلفی سے ملے۔ اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ افغانستان میں بھی آپ اپنے مطبع کی شاخ قائم کریں۔ نیساں لکھنوی جو منشی صاحب کے ہم عصر اور مطبع میں ملازم تھے انہوں نے اس واقعہ کو ایک نظم کی شکل دی جس کے دو بند اس طرح ہیں۔

لدھیانہ میں ہوا تھا جو دربار نامدار — اس میں بھی تھے شریک یہ منشی باوقار

ان کا بھی نامدار رئیسوں میں تھا شمار — بخشا تھا لیفٹیننٹ گورنر نے افتخار

یہ مشورت کے واسطے دربار خاص تھا

مخصوص تھا یہ بھید یہ اسرار خاص تھا

بٹھلا کے پاس امیر نے شیریں بیانی کی — الطاف سے کرم سے بڑی مہربانی کی

اوصاف ان کے دیکھ کے رطب اللسانی کی — بخشا وقار عزوشرف قدردانی کی

فرمایا، خوش، ہم ایسی ملاقات سے ہوئے

آکر یہاں نہ جیسی کسی بات سے ہوئے

منشی نولکشور امیر افغانستان کو نذر دینا چاہتے تھے۔ مگر انہوں نے قبول نہیں کی اور ایک شال پر چند اشرفیاں رکھ کر منشی صاحب کو پیش کیں اور کہا آپ مجھے نذرانہ نہ دیں آپ علم کے بادشاہ ہیں۔ مجھے چاہئے آپ کو نذرانہ دوں۔ (منظومہ سوانح نیساں لکھنوی۔ مطبوعہ ماہنامہ نیادور، لکھنؤ)

بادشاہ ایران سے ملاقات: ۱۸۸۲ء میں جب شہنشاہ ایران سیر و سیاحت کی غرض سے ہندوستان آئے تو منشی نولکشور بھی دہلی گئے اور وائسرائے ہند کی قیام گاہ پر ان سے ملاقات کی۔ شاہ ان سے مل کر بہت خوش ہوئے اور کہا کہ میری ہندوستان کی سیاحت اس اعتبار سے کامیاب رہی کہ آپ سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے فارسی کتابیں بکثرت شائع کر کے ہماری

زبان کی بہت خدمت کی ہے۔ جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ خود شاہ ایران نے منشی صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ کیونکہ اس وقت تک ایران کے کتاب خانوں اور درسگاہوں میں نولکشور پریس کی کتابیں اپنا مقام بنا کر رواج پا چکی تھیں۔

منشی نولکشور کی علمی، صحافتی اور اشاعتی سرگرمیوں کے باعث ان کے معاصر ارباب علم و فن ان کے قدرداں اور مداح تھے۔ اودھ اخبار اور مطبع کی خدمات سے ان حضرات کو بھی کم مدت میں ملک گیر شہرت حاصل ہوتی تھی۔ خود مرزا اسد اللہ خاں غالب سے منشی صاحب کا تعارف اودھ اخبار کے ذریعہ ہوا اخبار ہی کے توسط سے غالب ان کی اشاعتی سرگرمیوں سے باخبر رہتے تھے۔ غالب خود تو اس کے خریدار نہ تھے البتہ نواب ضیاء الدین احمد خاں سے لے کر پابندی سے دقیق مطالعہ کرتے تھے۔ اس میں غالب کے شاگردوں کا بھی کلام چھپتا تھا نیز دیگر مطبوعات کے انتشار کا بھی علم ہو جاتا تھا جس کے سبب غالب اس کو بہت دلچسپی سے پڑھتے تھے۔ غالب اور نولکشور کے غائبانہ تعارف کی ابتدا کا علم غالب کے ایک خط سے ہوتا ہے جو انھوں نے اپنے شاگرد منشی شیو پرشاد نرائن آرام کو جواباً ۱۲؍ نومبر ۱۸۵۸ء کو لکھا۔

"آج یکشنبہ ۱۳؍ نومبر کو لفافہ اخبار آیا۔ یہ اخبار بھائی ضیاء الدین کے ہاں آتا ہے۔ وہ میرے پاس بھیج دیا کرتے ہیں۔ اس کی حاجت نہیں اپنے میرے ٹکٹ کیوں برباد کرو۔

(خطوط غالب، مرتبہ غلام رسول مہر، مطبوعہ لاہور)

غالب اور نولکشور کو ایک دوسرے سے باخبر کرانے میں غالب کے شاگرد میاں داد خاں سیاحؔ کا بھی ہاتھ تھا۔ منی نولکشور نے غالب کو ایک خط لکھا وہ خط تو دستیاب نہیں البتہ اس بامحبت خط کو پاکر غالب کو جو مسرت ہوئی اس کا اندازہ غالب کی تحریر سے ہوتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ نولکشور نے فارسی میں جواب دینے کی خواہش ظاہر کی ہوگی۔ جس کے احترام میں غالب نے جواب فارسی میں لکھا اور اس کا تذکرہ بھی کیا کہ میری فارسی نثر کی

تین کتابیں: پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو ہیں یہ منگوایئے شاید اہل لکھنؤ اس کے مشتاق ہوں۔ منشی نولکشور نے جواباً غالب کی فارسی غزلیں بطور اشاعت مانگیں اور اخبار کی ممبر شپ کا تقاضا کیا۔ اب غالب نے وہ غزلیں دی ہوں یا نہیں، ہاں ان روابط کے باعث کلیات نظم فارسی اور دیگر مسودوں کی طباعت کی راہ ضرور نکل آئی۔ نیز دونوں میں تعلقات مستحکم تر ہوئے۔

ایک بار جب منشی نولکشور ۱۸۶۳ء ماہ دسمبر کے آغاز میں کاروباری سلسلہ سے دہلی گئے وہاں مرزا غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں اور ان کے بیٹے نواب شہاب الدین خاں سے ملاقات کی، منشی نولکشور سے غالب کی یہ پہلی ملاقات تھی۔ غالب نولکشور سے ملکر بہت خوش ہوئے، اس کا اندازہ اس تحریر سے ہوتا ہے جو انھوں نے ۳/ دسمبر کو ملا علاء الدین احمد خاں علائی کو خط لکھا، یہ تحریر منشی صاحب کی شخصیت اور سیرت کی آئینہ دار ہے، لکھتے ہیں:

"شفیق مکرم و لطف مجسم منشی نولکشور صاحب بہ سبیل ڈاک یہاں آئے، مجھ سے تمھارے چچا اور تمھارے بھائی شہاب الدین خاں سے ملے، خدا نے ان کو زہرہ کی صورت اور مشتری کی سیرت عطا کی ہے" اس ہی ملاقات کا تذکرہ غالب نے اپنے ایک خط مردان علی خاں کے نام میں ان الفاظ کے اندر کیا ہے:

"منشی نولکشور صاحب یہاں آئے تھے۔ مجھ سے ملے بہت خوبصورت اور خوش سیرت، سعادت مند اور معقول پسند آدمی ہیں، تمھارے وہ مداح ہیں اور میں ان کا ثناخواں"

نولکشور نے بھی ملاقات کے بعد لکھنؤ واپسی پر اس کی تفصیلات اودھ اخبار میں بڑی شیریں اور رنگین زبان میں شائع کیں جو ان کی دلی جذبات کی ترجمان ہیں۔

منشی صاحب نے غالب کی حسب ذیل کتابیں ان کی زندگی میں طبع کیں (۱) قاطع برہان، یہ پہلی کتاب ہے جو نولکشور نے اپنے مطبع سے چھاپی اس میں غالب نے محمد حسین کی مشہور فرہنگ "برہان قاطع" کے تقریباً تین سو الفاظ کے مطالب کو تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کو غلط قرار دیا۔ اس کی کتابت منشی امیر اللہ تسلیم نے کی جو اودھ اخبار کے مدیر بھی تھے۔

(۲) کلیات نظم غالب: غالب کا فارسی کلام جس کا مسودہ منشی نولکشور نے نواب ضیاء الدین احمد خاں سے حاصل کیا تھا ۱۸۶۳ء میں زیور طبع سے آراستہ کیا۔ اس کی کتابت مولوی ہادی علی اشک نے کی جس کے کل صفحات ۵۶۶ ہیں اور غالب کی تصویر بھی اس میں شامل ہے۔

(۳) دعائے صباح: ۲۴ صفحات کا مختصر کتابچہ، ایک فارسی مثنوی پر مشتمل ہے۔ دراصل یہ عربی دعا کا فارسی ترجمہ ہے جو غالب کے بھانجے مرزا عباس بیگ کی فرمائش پر طبع ہوا۔

(۴) کلیات نثر فارسی: اس میں غالب کی تین کتابیں پنج آہنگ، مہر نیم روز اور دستنبو شامل ہیں، جو ۱۸۶۸ء میں شائع ہوئی۔ غالب کی زندگی میں ہونے والی یہ ان کی آخری کتاب تھی۔ وفات کے بعد مطبع سے یہ کتابیں کئی بار شائع ہوئیں۔

جیسا کہ پہلے بھی ذکر آیا مرزا غالب ۱۸۵۹ء سے اودھ اخبار لے کر پڑھنے لگے تھے۔ مگر مفت کی مے کی مانند، منشی صاحب ان سے صرف ڈاک خرچ تین روپے لیتے تھے۔ ایک خط میں غالب نے علاء الدین کو لکھا تھا:

"میں تین جگہ کا روزینہ دار ہوں۔ ساڑھے باسٹھ روپیہ یعنی سات سو پچاس روپیہ سال انگریز سرکار سے پاتا ہوں اور بارہ سو سال رامپور اور ۲۴ روپیہ ان مہاراج نولکشور سے توضیح یہ کہ دو برس سے ہر مہینے چار بار اخبار مجھ کو بھیجا کرتے ہیں۔ قیمت نہیں لیتے۔ مگر اڑتالیس ٹکٹ میں مطبع میں پہنچا دیا کرتا ہوں۔

میر انیس اور منشی نولکشور: اردو زبان و ادب کی تاریخ میں جو زمانہ میر انیس اور مرزا دبیر کے مراثی کا دور کہلاتا ہے اس ہی زمانہ میں مطبع نولکشور قائم ہوا۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام بغاوت کے بعد لکھنؤ کی فضا پست ہمتی اور مایوسی کے غبار سے مکدر ہو چکی تھی۔ روایتی شاعری دم توڑ رہی تھی اور مرثیوں کی آواز سے لکھنؤ کے در و دیوار گونج رہے تھے۔ انیس کی مجلسوں

میں لوگوں کا اژدھام ہوتا۔ منشی صاحب بھی انیس کے کلام سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے انیس سے مل کر خواہش ظاہر کی کہ ان کے اخبار میں اپنے مراثی شائع کرائیں۔ اس وقت تو انیس نے اجازت نہ دی مگر ان کی وفات کے بعد منشی نولکشور نے سید تصدق حسین کنتوری (مولف لغات کشوری) کی مدد سے جد و جہد کے ساتھ جمع کر کے ان کی تصحیح کا کام انجام دیکر چار حصوں میں بڑی خواسلوبی کے ساتھ شائع کیا۔

اپنی خداداد غیر معمولی ذہانت،، پختہ عزم، جہد مسلسل، علم دوستی، ادب نوازی، علماء پروری حسن اخلاق و انتظام اور سیاسی سوجھ بوجھ کی بدولت ان کو ایسا عروج حاصل ہوا کہ حکومت اودھ نے ان کو امراءورؤسا کی صف میں شامل کرلیا۔ سرکاری اعزازات سے نوازا گیا۔ سیاسی رہنماؤں اور مذہبی پیشواؤں سے اچھے روابط رہے۔ ملک کے بعض والیان ریاست ان کو اپنی ریاست کا وزیراعظم بنانا چاہتے تھے۔ سرسید احمد خاں، نواب محسن الملک، مرزا اسد اللہ خاں غالب، مہاراجہ محمود آباد، نواب سالار جنگ، نواب کلب علی خاں، والی رامپور ان کے مداح اور علمی خدمات کے معترف تھے۔

۱۸۷۰ء میں ان کے ہم عصر دانشمند منشی وجاہت ایڈیٹر "اخبار عالم" نے ماہ اپریل کے اخبار میں لکھا تھا:

"منشی نولکشور صاحب ان کے اوصاف اور حالات لکھنے کی ضرورت نہیں۔ عیاں راچہ بیاں۔ ہندوستان، عرب و عجم، انگلستان، مصر و روم اور فرانس سب ملکوں میں ان کا نام روشن ہے۔ اس شخص کو اگر بانی علوم و فنون کہا جائے تو بجا..... حسن اخلاق اور عالی ہمتی اور دوست پروری میں منشی صاحب موصوف ہزارہا آدمیوں سے افضل واعلیٰ ہیں۔"

نولکشور تیئس چوبیس سال کے رہے ہوں گے کہ لکھنؤ میں سکونت اختیار کی۔ اپنے قیام کی مدت میں لکھنؤ کی تہذیب و تمدن کے سانچے میں اس طرح ڈھال لیا کہ وہ لکھنؤ کے خاندانی روساء و نوابین کے ہم پلہ نظر آنے لگے تھے۔ اودھ کے ہندو و مسلم روساء نے گنگا جمنی

تہذیب کے علمبردار کو اپنی برادری میں بلا تکلف شامل کر لیا تھا۔ جس میں ان کی صورت اور سیرت دونوں کو دخل تھا۔ کہتے ہیں منشی صاحب نہایت خوبصورت خدوخال کے خوشرو آدمی تھے۔ ان کی شخصیت جاذب نظر تھی، عموماً سادہ لباس زیب تن کرتے مگر جامہ زیبی بہت تھی۔ قدو قامت نہایت موزوں، کشادہ پیشانی، چہرہ مہرہ بہت دلکش، داڑھی ابتدا ہی سے رکھ لی تھی جس نے ان کی شخصیت کو اور باوقار بنادیا تھا۔ بہر حال ثبات تو اس دنیا میں کسی کو بھی نہیں۔ علم وادب کی خدمات کا یہ کارواں رواں دواں تھا کہ ناگہاں موت کے آہنی پنجہ نے انھیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ اور وہ سب کو سوگوار بنا اپنے معبود حقیقی سے جا ملے اور اپنے پیچھے ایک پر نہ ہونے والا خلا چھوڑ گئے۔ ان کے جسد خاکی کو ریلوے حکام کی مدد سے ایک خصوصی ٹرین کے ذریعہ کانپور لے جایا گیا جہاں دریائے گنگا کے کنارے آخری رسوم ان کے متبنیٰ منشی پراگ نرائن نے ادا کیں۔ نیساں لکھنوی نے اپنی منظوم سوانح میں اس وقت کی کیفیات کو یوں بیان کیا ہے پہلا بند ملاحظہ ہو۔

انسٹھ برس گذارے اسی آن بان سے — جاہ و حشم سے، فخر سے عزت سے، شان سے
خدمات ملک کرتے رہے دل و جان سے — نام و نشان بلند کیا کل جہان سے
بے وقت اجل نے آکے سر دست گھات کی
آخر کو شام ہوگئی صبح حیات کی

منابع :-
۱۔ منشی نو لکشور حالات اور خدمات ازامیر حسن نورانی
۲۔ منشی نو لکشور اور ان کے خطاط وخوش نویس۔ ازامیر حسن نورانی
۳۔ نیادور، منشی نو لکشور نمبر۔

باغبان علم وادب منشی نولکشور کی خدمات

نصرت ناهید

لائیبرین، امیر الدولہ پبلک لائبریری، لکھنؤ

منشی نولکشور اپنی عملی ادبی ثقافتی صحافتی اور طباعتی خدمات اور اہم کارناموں کی بنا پر عالم گیر شہرت کے مالک ہیں۔ ان کا شمار اہم محسنین اردو اور بے لوث و نیک نام ادبی خدمت گزاروں میں ہوتا ہے۔ علوم مشرقیہ کے اس عظیم محسن نے ۱۸۵۸ء میں جو شمع روشن کی تھی اس کی ضیاپاشی سے دنیائے علم وادب آج بھی منور ہے۔

منشی جی کی ولادت ایک خوش حال بھارگو برہمن گھرانے کے فرد علی گڑھ کے باشندے جمنا پرشاد بھارگو کے گھر موضع ریڑھا میں جو متھرا ضلع میں واقع تھا ۳؍جنوری ۱۸۳۶ء کو ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم سانسی ضلع علی گڈھ میں رواج زمانہ کے مطابق قدیم طرز پر عربی، فارسی سے ہوئی اس کے بعد آگرہ کالج میں داخلہ لیا اور تکمیل کی۔ بچپن سے ذہین وطباع تھے اور لکھنے پڑھنے کا شوق تھا۔ کم سنی میں ہی ان کے مضامین آگرہ کے اخبار "سفیر" میں شائع ہونے لگے تھے اسی زمانے میں مالک اخبار "کوہ نور" وہ کوہ نور پریس، لاہور کو اپنے ادارہ کے لئے مددگار کی ضرورت تھی چنانچہ انہوں نے اپنے بھائی رائے مکھن لال کو جوان دنوں آگرہ کے منصف تھے تحریر کیا کہ کسی ایماندار، محنتی اور باصلاحیت شخص کا انتخاب کرکے بھیج دیجئے۔ رائے مکھن لال کی نظر ہونہار نوجوان نولکشور پر پڑی اور انہیں آمادہ کرکے رائے ہرسکھ لال مالک کوہ نور پریس لاہور کے پاس بھیج دیا۔ منشی جی کوہ نور اخبار و پریس سے تقریباً چار سال وابستہ رہے اور اس عرصہ میں انہوں نے کتابت، طباعت مراسلت اور صحافت کا

تجربہ حاصل کیااور اپنی خداداد صلاحیتوں کا مظاہرہ کرنے کے ارادے سے لکھنؤ پہنچے اور وہاں کی ادبی و ثقافتی وراثت نے ایسا متاثر کیا کہ پھر وہیں کے ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب نواب واجد علی شاہ کی عمل داری ختم ہو چکی تھی اور انگریزوں کا تسلط قائم ہو چکا تھا۔ ہر طرف ظلم و جبر اور تباہی و بربادی کے مناظر تھے۔ اخلاقی قدریں دم توڑ رہی تھیں اور نئی تہذیب جس میں مغربی تہذیب و تمدن کے اثرات نمایاں تھے پنپ رہی تھی۔ علمی، وادبی، تہذیبی، معاشرتی اور معاشی زندگی پر ظلم و بربریت اور انتقامی کارروائیوں کے سائے تھے۔ علمی اور ادبی مراکز، کتب خانے دانش گاہیں، تہذیبی یادگاریں سب کچھ معدوم ہو رہا تھا۔ گہوارہ علم و فن اور مرکز تہذیب و تمدن، لکھنؤ بھی انہیں حالات کا شکار تھا۔ سلطنت اودھ ختم ہو چکی تھی اہل کمال منتشر ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی مٹی میں پیوست صدیوں پرانی تہذیبی جڑیں ابھی خشک نہیں ہوئی تھیں۔ علم وادب، علوم و فنون، اور تہذیب و تمدن کے چراغ کی لو تھرا تھرا رہی تھی لیکن وہ بجھا نہیں تھا۔ اس زوال پذیر معاشرے کے حالات سے متاثر ہو کر منشی نولکشور جن کے دل میں ترقی ملک و قوم، علم وادب کے فروغ اور تہذیب وراثت کی حفاظت کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا لکھنؤ میں ہی قیام کرنے اور پریس قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

۱۸۵۸ء میں اپنا ذاتی مطبع ''نولکشور پریس'' قائم کیا تھا۔ انہوں نے چند ہینڈ پریس اور پتھر خرید کر محلّہ ڈیوڑھی آغا میر کے ایک چھوٹے سے کرائے کے مکان میں کام کا آغاز کیا تھا۔ سب سے پہلی کتاب ان کے پریس میں چھپنے والی پٹواریوں کی پیمائش کی کتاب تھی پھر تعزیرات ہند شائع کرنے کو ملا۔ لکھنؤ کا انگریز کمشنر کرنل ایبٹ منشی جی کے عزم و حوصلہ اور صلاحیتوں سے متاثر اور انکا قدرداں تھا۔ کتاب چھپی تو ان کی تحریک پر حکومت نے اس کی تیس ہزار جلد خرید لیں اس پہلے سودے نے حوصلہ مند نوجوان کی ہمت افزائی کی اور اس کے

قدم تیزی کے ساتھ بڑھتے گئے۔ تھوڑے دنوں بعد مطبع نولکشور ڈیوڑھی آغا میر سے گولہ گنج منتقل ہو گیا پھر وہاں سے والئ اجودھیا راجہ مان سنگھ کی کوٹھی میں گیا جو منشی جی پر بے حد مہربان تھے۔ منشی جی اس شاندار کوٹھی سے بھی مطمئن نہیں تھے چنانچہ ۱۸۷۰ء میں انہوں نے حضرت گنج میں ایک وسیع وعریض احاطہ خرید لیا جس میں کچھ عمارتیں موجود تھیں۔اس کے بعد حسب ضرورت تعمیرات میں اضافہ ہوتا رہا۔شروع میں دستی پریس سے ہی کام چلتا تھا پھر ولائتی مشینیں منگا کر نصب کیں۔جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے مطبع کی شہرت ومقبولیت میں اضافہ ہوتا گیا۔

مطبع منشی نولکشور کی شہرت ومقبولیت ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھی بلکہ ان کی مطبوعات کی، افغانستان، ایران، عرب ممالک اور جنوبی افریقہ وغیرہ میں بھی بڑی قدر ومنزلت تھی۔

ابتدائی دور میں مطبع منشی نولکشور نے مختلف موضوعات پر چھوٹی چھوٹی کتابیں شائع کیں۔جب وسائل میں خاطر خواہ اضافہ ہو گیا تو فارسی زبان کی اہم اور نایاب کتابوں کی اشاعت کی طرف توجہ ہوئی۔

سلطنت مغلیہ کے خاتمہ اور انگریزوں کے تسلط نے شیرازۂ علم وادب منتشر کر دیا تھا، لیکن چلن فارسی زبان کا ہی تھا علماء فضلاء سرکاری وغیر سرکاری اداروں اور تعلیم یافتہ عوام میں فارسی ہی رائج تھی۔اردو زبان ارتقائی منازل میں تھی انگریزی سے عام لوگ واقف نہ تھے۔ منشی نولکشور نے غور خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ فارسی زبان میں ادبیات کے علاوہ مذہبی ،تاریخی اور اخلاقی کتابوں کا عربی، سنسکرت اور دیگر زبانوں کے اہم لٹریچر کا فارسی میں ترجمہ کرایا جائے اور مطبع نولکشور انھیں شائع کرے۔ادارے نے ملک بھر کے نامور مترجمین کی خدمات حاصل کر کے لاتعداد گرانقدر کتابوں کے فارسی زبان میں ترجمے کرائے اور کثیر تعداد

میں شائع کرنے کا شرف حاصل کیا، اور اس کی شہرت و مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔

مصنفین و مترجمین کی فہرست میں اپنے دور کے مشاہیر ادب :-

۱- مولانا غلام سرور لاہوری	۱۱- مولانا قطب الدین دہلوی
۲- مولانا خرم علی	۱۲- نوبت رائے کی نظرؔ
۳- مولانا امیر علی ملیح آبادی	۱۳- آسیؔ غازی پوری
۴- مولانا فضل احمد	۱۴- منشی زوّار حسین
۵- مولانا احتشام الدین	۱۵- طوطا رام شایاںؔ
۶- ہادی علی اشکؔ	۱۶- عابد حسین جعفری
۷- قدرؔ بلگرامی	۱۷- دوار کا پرشاد افقؔ
۸- مولانا قطب الدین	۱۸- رتن ناتھ سرشارؔ
۹- منشی امیر اللہ تسلیمؔ	۱۹- مرزا حیرت دہلوی
۱۰- مولانا احسن نانوتوی	۲۰- تصدیق حسین دہلوی

اور لا تعداد دیگر باکمالان ادب کے نام شامل ہیں۔

مطبع منشی نولکشور کی مطبوعات جن کا اندازہ دس ہزار سے زائد لگایا جاتا ہے، قرآن شریف، احادیث اور دیگر اسلامی کتب، رامائن، بھاگوت گیتا، اپنشد، گرو گرنتھ صاحب، جنم ساکی، تورات، انجیل، ہزاروں اوراق پر مشتمل ضخیم داستانیں، لغات، تاریخی کتب، شعرائے قدیم کے دواوین وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اگر مطبع منشی نولکشور نے یہ بیڑا نہ اٹھایا ہوتا تو لاتعداد گرانقدر تصانیف زیور طبع سے آراستہ ہونے کے بجائے تلف ہو جاتیں اور ہم ان کے ناموں اور ان کے صاحب کمال مصنفین سے واقف بھی نہ ہوتے۔

اودھ اخبار :-

منشی نولکشور نے ۱۸۵۸ء میں والی اجودھیا راجہ مان سنگھ کی کوٹھی میں مطبع اودھ اخبار (مطبع نولکشور) قائم کیا تھا اور اپنی دیرینہ آرزو کی تکمیل میں ایک ہفت روزہ کا اودھ اخبار کے نام سے اجرا کیا تھا، جو دیکھتے ہی دیکھتے شہرت و مقبولیت کے بام عروج تک پہونچ گیا اور اسے ہندوستان کے سب سے بڑے اور سب سے اچھے اردو اخبار کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ اس کے قدرداں صرف ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ بیرونی ممالک میں بھی تھے۔ یہ فرانس، لندن اور دیگر مغربی ممالک میں بھی پڑھا اور پسند کیا جاتا تھا اردو کے ممتاز مستشرق گارساں دتاسی جنہیں یہ اخبار ایڈورڈ ہنری پامرس جو عملے میں شامل تھے بھیجا کرتے تھے، لکھتے ہیں:

"یہ اخبار پچھلے سات سال سے نہایت کامیابی کے ساتھ نکل رہا ہے اس کی ہر اشاعت پچھلی اشاعتوں سے بہتر نظر آتی ہے اس کی تقطیع اور صفحات کی تعداد بھی بڑھتی جارہی ہے یہ اخبار ہفتہ وار ہے اور چہار شنبہ کے روز شائع ہوتا ہے شروع شروع میں اس میں صرف چار صفحے ہوا کرتے تھے اور وہ بھی چھوٹی چھوٹی تقطیع پر پھر چھ ہوئے اور پھر سولہ اور اب اڑتالیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے..... میرے خیال میں اس سے زیادہ ضخیم اخبار ہندوستان بھر میں اور کوئی نہیں ہے"۔

اودھ اخبار میں مشاہیر ادب کے حالات اور ان کی تخلیقات بکثرت چھپتی تھیں۔ دنیا بھر کی اہم خبروں کے علاوہ قوانین سرکاری احکامات کے ترجمے، عدالتی اور میونسپل کمیٹی کی کاروائیوں کے متعلق اطلاعات عوام کے علم کی غرض سے شائع کی جاتی تھیں۔

اودھ اخبار کے ابتدائی دور میں ادارت کے فرائض خود منشی جی انجام دیتے تھے لیکن اخبار کی اشاعت میں روز افزوں اضافہ اور کثرت کار کی وجہ سے دوسرے دور میں ادارت کی ذمہ داری صف اول کے ادبا و شعرا کے سپرد کر دی جن میں غلام احمد تپش، رتن ناتھ سرشار،

امیر اللہ تسلیم۔ ہادی علی اشکؔ، عبدالمجید سحرؔ، نسیم دہلوی، عبدالحلیم شررؔ اور دردؔ بلگرامی وغیرہ شامل تھے، اس کے بعد جالب دہلوی، نادر حسین نادرؔ کاکوروی اور احمد علی کاملؔ نے ادارت کے فرائض انجام دئے تیسرے دور میں یہ اہم ذمہ داری انجام دینے والوں میں دبی پرشاد سحرؔ، مرزا محمد عسکری، عبدالباری آسیؔ، پریم چند، یگانہؔ چنگیزی، پیارے لال شاکرؔ اور شوکت تھانوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اودھ اخبار ہندوستان کا پہلا اور باقاعدہ شائع ہونے والا اخبار تھا، نہ اردو میں کوئی اخبار اس کے معیار حیثیت کا تھا نہ ہی دیگر ہندوستانی زبانوں میں۔ اس کی اہمیت و مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ ۱۸۵۸ء سے ۱۹۵۰ء تک اپنے دور کا کوئی بڑا ادیب و شاعر ایسا نہیں تھا جو اس سے کسی نہ کسی شکل میں وابستہ نہ رہا ہو۔ یہ پہلا اردو میں شائع ہونے والا اخبار تھا جس کے اپنے خبر رساں و نمائندے تمام ملک میں ہی نہیں، لندن میں بھی موجود تھے۔ لندن میں اودھ اخبار کے نمائندے ماہر لسانیات پروفیسر ای۔ ایچ۔ پامرس تھے۔ اس زمانے میں مشہور تھا کہ صوبوں اور ریاستوں میں حکومت نمائندے رہ رہے ہیں یا منشی نولکشور کے۔ منشی جی نے "اودھ ریویو" کے نام سے انگریزی جریدہ بھی نکالا تھا اودھ اخبار میں اردو کی متعدد ضخیم اور اہم کتابیں بھی قسط وار شائع ہوئیں۔ جن میں فسانۂ آزاد بھی شامل تھا۔

منشی نولکشور نہایت بالغ نظر، فراخ دل، دردمند، شریف النفس، دور اندیش، ملک دوست، ہمدرد قوم، تمام مذاہب اور بزرگوں کا احترام کرنے والے، قومی یک جہتی کے علم بردار، فروغ علم کے لئے کوشاں اور اعلیٰ صفات کے حامل سماجی کارکن تھے۔ مذہبی یا لسانی تعصب کی ان کے یہاں کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اپنے عملے کے لوگوں کی فلاح بہبود پر ان کی خاص نظر رہتی تھی۔ جس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب ان کے یہاں بڑی تعداد میں ولایتی مشینیں آگئیں تو انہوں نے دستی پریس جو لوگ چلاتے تھے انہیں کو یدئے اور اپنا کام

انہیں دے کر ان کی آمدنی میں اضافہ کرتے رہے۔ اس طرح ایک طرف عملے کے لوگوں کو اپنی آمدنی میں غیر متوقع اضافہ کرنے کا موقع ملا اور دوسری طرف شہر کے مختلف گوشوں میں پریس لگ گئے۔

منشی جی کی شہرت و مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ جب شاہ ایران ۱۸۸۸ء میں ہندوستان آئے کلکتہ کی ایک پریس کانفرنس میں کہا "ہندوستان آنے کا میرا مقصد دو شخصیتوں سے ملاقات کا تھا اول وائسرائے سے دوئم منشی نول کشور سے۔"

اسی طرح ۱۸۸۵ء کے لدھیانہ دربار میں افغانستان کے امیر نے منشی جی سے ملتے ہوئے کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ ہم آپ کو دیکھ پائے۔ میرا یہ سفر ہند اسلئے کامیاب رہا کہ آپ سے ملاقات ہوئی"۔

مرزا اسد اللہ خاں غالب نے لکھا :

"لکھنؤ کے چھاپے خانے نے جس کا دیوان چھاپا اس کو آسمان پر چڑھا دیا۔"

اودھ کے چیف کمشنر ویل فلیڈ نے ۱۸۶۱ء میں حکومت کو لکھا:

"منشی نول کشور" بڑے لائق شخص ہیں اور اودھ میں ان کا مطبع سب سے اچھا ہے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا (نقوش سلیمانی صف ۷۷)

"...... لکھنؤ کے اس مطبع کا نام لیا جاتا ہے جس کی عمر اب اسی برس کے قریب پہنچ گئی ہے۔اس سے مراد نولکشور کا مشہور "نولکشور پریس" ہے یہ غدر کے بعد ۱۸۵۸ء میں قائم ہوا اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ مشرقی علوم فنون کی جتنی ضخیم اور کثیر کتابیں اس مطبع نے شائع کیں ان کا مقابلہ ہندوستان کیا مشرق میں کوئی نہیں کر سکتا۔"

منشی نول کشور اپنی تقریباً ۵۹ سالہ زندگی کے ۳۵ سال بیش بہا علمی، ادبی، ثقافتی،

سیاسی اور سماجی خدمات میں گزار کر ۱۹ر فروری ۱۸۹۵ء کو موت سے ہم کنار ہو گئے۔

مورخ جب تاریخ ادب پر قلم اٹھائے گا تو منشی نول کشور کی بیش بہا خدمات اور اہم کارنامے تاریخ کا روشن باب ہوں گے اور جب تک علم و ادب سے لگاؤ رکھنے والا ایک فرد بھی باقی رہے گا۔ منشی نول کشور اور ان کے احسانات عزت و احترام کے ساتھ یاد کئے جائیں گے۔

منشی نولکشور سمینار کے متعلق
شرکاء کے تأثرات

".......... آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، مبارکباد دیتے ہوئے اور رانی لیلا بھارگو صاحبہ اور رنجیت بھارگو صاحب کو آپ ہی کے توسط سے شکرانہ پیش کر کے ہم لوگ صحیح وقت پر دہلی کے لئے بادلِ ناخواستہ روانہ ہوئے اور جب تک نیند نہیں آئی، آپ کے سمینار کی روداد، سادہ ورنگین افتتاح، منظّم اور بروقت اجلاس اور مقالوں کی قرآت، پذیرائی اور مہمان نوازی میں آپکی خوش سلیقگی، حسن انتظام اور عالمانہ اخلاص کا ذکر ہر طرح سے ہوتا رہا۔

اس بار بار کے ذکر میں عزیزی شیمہ رضوی صاحبہ، آصف میاں کی تیز رفتار کارکردگی اور قدم قدم پر ہم لوگوں کی ہر ضرورت اور مطالبہ کی مناسب تکمیل وغیرہ کا بھی ذکر خیر ہوتا رہا اور پھر مرحوم رضوی صاحب کا ذکر کیسے نہ آتا جو اسکے مجوّز، جوید اور روح رواں تھے.... اس پروگرام کی تنظیم و تزئین میں آپ کی انتھک کوششوں کے پس پردہ انہیں کی ذات گرامی تھی.........."

پروفیسر شعیب اعظمی

جامعہ ملیہ اسلامیہ دھلی

۲۰/دسمبر ۱۹۹۸ء مطابق یکم ماہ رمضان المبارک

"....... میں کن الفاظ میں آپکے الطاف و اکرام کا شکریہ ادا کروں آپ کے

کامیاب ترین سمینار میں شریک ہو کر یادگار مسرت وشادمانی حاصل ہوئی اتنا کامیاب ترین سمینار، یک روزہ، نہ دیدہ نہ شنیدہ۔ یہ سب آپکے حسن نیت واخلاص کا ثمرہ ہے اور بس۔ عزیزہ محترمہ شیمہ سلمہا کے حسن کارکردگی اور انتظامی صلاحیت سے بے حد متأثر رہا۔ اللہ تعالیٰ ان کے اقبال ودرجات میں اضافہ فرمائے۔ آمین

پروفیسر طلحہ رضوی برقؔ

ویر کنور سنگھ یونیورسٹی۔ آرہ۔ بہار

۱۲ر رمضان المبارک ۱۴۱۹ھ

"......... تم نے ماشاءاللہ ایسا اچھا سمینار کیا کہ اس کا جواب ناممکن ہے میرا تو دل خوش ہو گیا۔ ہر چیز مکمل طور پر منظم، پروقار، خوبصورت اور امیجینیٹو۔ تم نے اتنی شدید پریشانی اور اس عظیم غم کو برداشت کرنے کے ساتھ ایسی ہمت، بردباری اور تحمل کیساتھ ہر کام کو انجام دیا کہ ہر شخص تمہارا قائل ہو گیا۔ افتتاحیہ سے لے کر آخری جلسہ تک ہر چیز اپنی جگہ مکمل تھی۔ بتاؤ میں کن الفاظ میں تعریف کر سکتی ہوں.... تمہارے بچے ماشاءاللہ اس قدر پیارے، ذہین اور سمجھدار ہیں کہ آصفہ وہ تمہارے لئے ایک بڑی نعمت ہیں۔ کس حسن وخوبی اور تن من سے انہوں نے تمہارا ساتھ دیا... شیمہ میں ماشاءاللہ کس قدر صلاحیتیں کوٹ کوٹ کر بھری ہیں۔ اکیڈمی کا خبرنامہ پڑھ کر تو میں اس بات کا اندازہ کرتی ہی تھی کہ چارج لینے کے بعد کس طرح اس نے بے شمار سیمنار اور اکیڈمک پروگرام مسلسل کئے۔ لیکن اب تو اپنی آنکھوں سے اسکی انتظامی صلاحیتوں کو دیکھ لیا۔ کمال ہے کہ ہم ایک بجے رات کو گیسٹ ہاؤس پہونچے اور وہ اپنی ٹیم کے ساتھ، نہایت خوش مزہ اور گرم گرم کھانا لئے ہماری منتظر تھی۔ اور

اسی سرگرمی اور انہماک کے ساتھ وہ پورے سمینار میں لگی رہی..... میں نے یہ بھی دیکھا کہ کس طرح گورنر صاحب اور وزیر تعلیم نے اور تمہاری وائس چانسلر صاحبہ نے تمہارے پروگراموں میں دلچسپی لی اور شرکت کی۔ صاف ظاہر ہے ان سب کی نظروں میں تمہارا ایک خاص مقام ہے اور تم یقیناً اس کی مستحق ہو۔ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ اس تمام مصروفیت اور سرگرمی میں تمہاری نظریں ایک شخص کی متلاشی تھیں۔ وہ شخص جس نے تم کو یہ سمینار کرنے کا حوصلہ بخشا تھا۔ تمہاری اس محرومی اور دلی صدمہ کا شاہد وہ لمحہ تھا جب تم افتتاحی تقریر کے دوران اپنی آواز پر قابو نہ پا سکیں، لیکن تم نے جس سوبر اور متین طریقہ سے اپنے غم کو برداشت کئے رکھا وہ قابل تعریف ہے...... آصف ماشاء اللہ بے حد سلجھا ہوا مہذب اور مخلص بچہ ہے آجکل اس دور میں ایسے لڑکے کہاں نظر آتے ہیں.......

پروفیسر آذرمی دخت صفوی

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۶/ ۱۲/ ۱۹۹۸ء

"...... آپکے سمینار "منشی نولکشور ----- کی جامعیت، افادیت، حسن انتظام، لگن اور خلوص کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، واقعی انگوٹھی پر نگینہ بٹھانا اسی کو کہتے ہیں ایک مثالی سمینار بلا کسی مبالغہ کے اس کو قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس کامیابی کا سہرا نہ صرف آپکے، شیمہ اور آصف کے بلکہ آپ کی پارٹی کے ارکان اور غالباً شیمہ کے آفس والوں کے سر بھی جاتا ہے جنہوں نے آپکے خیالی دانشمندانہ خاکے میں رنگ بھرنے کے اندر بھرپور تعاون دیا..... شیمہ صاحبہ سے ملاقات بہت عرصہ بعد ہوئی مگر مل کر جی خوش ہو گیا۔ اپنائیت، خلوص اور

سادگی سب اپنی جگہ مجسم..... آصف کو تو ذرا دیر بعد ہی پہچانی، مگر اس کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ نے پہلے ہی لمحے سے متأثر کیا۔ میں سوچتی رہی کہ یہ اتنا اسمارٹ اور پھر تیلا نیز بااخلاق لڑکا سمینار میں مدد کرانے کے لئے آصفہ آپا کو کہاں سے مل گیا۔ بعد کو یہ بھید کھلا کہ یہ تو ''آصفہ آپا ہی کا شاہکار ہے.....''۔

ڈاکٹر قمر غفار

جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی

۱۳/۱/۱۹۹۹ء

ڈاکٹر آصفہ زمانی کی کتابیں

۱- ہندوستان کے بیسویں صدی کے مشہور فارسی محققین وناقدین (مع مختصر تاریخ نقد و تحقیق) (مقالہ ڈی۔لٹ، بزبان فارسی)		۸- جدید ادبی جائزے (حصہ نثر) (اردو کے مشہور نثر نگاروں کا تنقیدی جائزہ)
۲- طالب آملی۔ فکر و فن (ملک الشعراء طالب آملی کی سوانح حیات اور اس کے کلام پر مبسوط تبصرہ) (انعام یافتہ اردو اکادمی، حکومت اتر پردیش)		۹- جدید ادبی جائزے (حصہ نظم) (اردو کے مشاہیر شعراء کا تنقیدی جائزہ)
۳- پرتو تحقیق (فارسی زبان وادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) (انعام یافتہ اردو اکادمی، حکومت اتر پردیش)		۱۰- یہ ایک تبسم (ریڈیائی مزاحیہ خاکے)
۴- مقالات زمانی (اردو فارسی زبان وادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) (انعام یافتہ اردو اکادمی، حکومت اتر پردیش)		۱۱- شرح نثر باستان (فارسی زبان وادب سے متعلق مختلف شعری ادب پاروں کا اردو میں ترجمہ)
۵- مطالعات زمانی (اردو فارسی زبان وادب سے متعلق تحقیقی و تنقیدی مضامین کا مجموعہ) (انعام یافتہ اردو اکادمی حکومت اتر پردیش)		۱۲- شرح شعر باستان (فارسی زبان وادب سے متعلق مختلف شعری ادب پاروں کا اردو ترجمہ)
۶- نگارشات زمانی (انعام یافتہ اردو اکادمی، حکومت اتر پردیش)		۱۳- اردو ساہتیہ کا اتہاس (ہندی زبان میں اردو زبان وادب کی مختصر تاریخ)
۷- بات چیت (انعام یافتہ اردو اکادمی، حکومت اتر پردیش)		۱۴- مختصر تاریخ فارسی
		۱۵- اردو سیکھو (نو آموز حضرات کے لیے اردو زبان کی معلومات)
		۱۶- فارسی سیکھو (نو آموز حضرات کے لیے فارسی زبان کی مشق)
		۱۷- نگار خانہ غالب

ڈاکٹر آصفہ زمانی کی کتابیں

